ہیرے کا جگر

مائل خیرآبادیؒ

یہ ناول

آج تک جتنے ناول شایع ہو چکے ہیں "ہیرے کا جگر" ہر حالت میں ان سب سے مختلف ہے "ہیرے کا جگر" نہ تو رومانی ناول ہے اور نہ جاسوسی، یہ دو موضوع ایسے ہیں جو عوام کی نظر میں کسی ناول کی جان ہوتے ہیں اور اسی لئے بازار میں ایسے ناولوں کی مانگ ہے۔

"ہیرے کا جگر" پڑھ کر ایک عام شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک اخلاقی ناول ہے لیکن یہ اس کے سطحی مطالعہ کا فیصلہ ہوگا "ہیرے کا جگر" دراصل ایک تربیتی اور تحریکی ناول ہے جو ایک بچے کے مختلف کرداروں کے گرد اس وقت تک گھومتا ہے جب تک وہ بچہ، بچہ رہتا ہے۔ بچہ جیسے ہی بالغ ہوتا ہے ناول اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے یعنی اچانک ختم ہو جاتا ہے۔ پڑھنے والا ایک جھٹکا سا محسوس کرتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ پھر کیا؟

اس "پھر کیا" کا جواب یہ ہے کہ اگر آپ اس طرح کی تربیت کو پسند کرتے ہیں تو اس کتاب میں ان اصولوں کو تلاش کیجئے جن کی بدولت کتاب کا ہیرو "ایک بچہ" پروان چڑھا اور پھر اپنے کو اور اپنوں کو انہی صحت مند اصولوں کے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کیجئے۔ "ہیرے کا جگر" کا یہی تقاضا ہے۔

تربیتی اور تحریکی ناول کا نام سن کر یہ خیال ہو سکتا ہے کہ یہ ایک خشک اور واعظانہ ناول ہوگا لیکن یہ

خیال اسے مطالعہ کئے بغیر تو قائم کیا جا سکتا ہے۔ ناول پڑھنے کے بعد یہ خیال باقی نہیں رہ سکتا۔

مصنف نے یہ ناول لکھنے کے بعد اُسے ماہنامہ "حجاب" میں شائع کرنا شروع کیا تو اس کی پہلی قسط میں کردار نگاری کی نظافت اور زبان و بیان کی لطافت دیکھ کر مبارک باد کے خطوط آنا شروع ہو گئے۔ دوسری تیسری قسطوں کے بعد مطالبہ شروع ہو گیا کہ اُسے جلد سے جلد کتابی شکل میں آجانا چاہیئے۔ بمبئی کے ایک بزرگ نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ اس کا ہندی ایڈیشن فوراً آنا چاہیئے۔ مدراس کے ایک بھائی مقامی زبان میں اس کا ترجمہ کر رہے ہیں اور وہ جلد ہی اسے کتابی شکل میں شایع کرنے والے ہیں۔

ناول کے مصنف کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ وہ اس جلد بازی کے حق میں نہیں تھے وہ چاہتے تھے کہ ناول "حجاب" میں چھپ لے اس کے متعلق مشورے سامنے آجائیں۔ ان مشوروں کو سامنے رکھ کر ناول میں ترمیم و اضافے کر لیے جائیں تب اسے کتابی شکل دی جائے چنانچہ "ہیرے کا جگر" کی قسطیں چھپتی رہیں۔ مصنف کی حوصلہ افزائی کے ساتھ انہیں مشورے ملتے رہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول نگاری میں صرف مصنف کا قلم ہی متحرک نہ تھا بلکہ اس کے پیچھے اعلیٰ درجے کے ذہن جنبش میں تھے۔

اس طرح یہ تربیتی و تحریکی ناول "ہیرے کا جگر" مختلف مرحلوں سے گذر کر اب بصورت کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ کیسے کیسے کردار پیش کرتا ہے؟ اس کی زبان کیسی ہے؟ اس کا اندازِ بیان کیا ہے؟ ناول خشک و افسردہ ہے یا شاداب و شگفتہ؟ اس کے جواب میں ہم صرف اتنا کہہ کر آپ کو ناول کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں کہ :-

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

اللہ تعالیٰ مصنف کی اس سعی کو قبول فرما کر بہترین اجر سے نوازے۔ آمین

——— ناشر

سب کے نام !

بچاؤ !

- اپنے آپ کو !
- اپنے گھر والوں کو !
- جہنم کی آگ سے !

قُوا اَنفُسَکُمْ وَاَھلِیکُمْ نَارًا

(القرآن)



فہرستِ مضامین

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم ؕ

ہیرے کا جگر

ننھا رشاد دروازے پر کھڑا بکریوں کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک، دو، تین.... چار.... پانچ وہ گننے لگا۔ ابھی وہ گن ہی رہا تھا کہ ایک بکری ممیائی، ننھے رشاد کی نظر اسی پر جم گئی —— بکری کا سیاہ و سفید ملا جلا رنگ اور چھوٹا سا قد اسے بہت اچھا لگا۔ اس کی نظر بکری کے دودھ بھرے تھنوں پر پڑی۔ اس نے کچھ سوچا۔ سوچ کر مڑا۔ دوڑا دوڑا ماں کے پاس گیا۔

"امی جان! امی جان! ابو میاں سے ڈر لگتا ہے نہیں تو وہ جو کالی اجلی، چھوٹی والی بکری ہے نا! امی جان! اتنے اتنے تھن ہیں اس کے!" بھولے اور ننھے بچے نے منے منے ہاتھوں سے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ماں ننھی کے لئے دودھ بنا رہی تھی۔ اس نے بچے کا بھولا بھالا انداز دیکھا۔ پیار اس کی آنکھوں میں امنڈ آیا۔ اس نے بھی اسی لب و لہجہ میں کہا "اِتنے اِتنے تھن ہیں اس کے؟"

"جی ہاں امی جان! ڈھیروں دودھ ہے ان میں!"

"تو پھر؟"

تو پھر، امی جان! ابو میاں سے ڈر لگتا ہے نہیں تو ......!" اور وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ صدر دروازے کی طرف اس طرح دیکھنے لگا۔ جیسے اس کے ابّو میاں آ ہی گئے ہوں اور وہ اس کی غلطی پہ کہہ رہے ہوں۔" رشاد میاں! بُری بات!!" ماں بچے کے بھولے پن پر مسکرا دی۔ بولی ابو میاں کا ڈر نہ ہوتا تو......؟"

تو میں وہ بکری پکڑ لیتا اور جھٹ کواڑ بند کر لیتا۔ آپ کے دودھ نہیں ہے جو!!

"رشاد میاں! تم ابو میاں سے تو اتنا ڈرتے ہو اور اللہ میاں سے نہیں ڈرتے؟"

"ڈرتا تو ہوں۔ بہت ڈرتا ہوں اللہ میاں سے!"

"تو پھر ابّو میاں کا ڈر کیوں؟"

"دیکھئے تو! اللہ میاں، جب قیامت ہو گی نا! تب سزا دیں گے۔ ابو میاں تو ابھی پیٹ دیں گے۔"

بیٹے کی بات پر ماں کو ہنسی آ گئی۔ اسی وقت دروازے پر کھنکھارنے کی آواز آئی۔ "ابو میاں آ گئے۔" ماں بیٹے دونوں کی زبان سے ایک ساتھ نکلا۔ ماں نے آنچل سنبھالا اور ننھا رشاد باپ کے استقبال کو دروازے کی طرف دوڑا "السّلام علیکم ابو میاں!"

وعلیکم السّلام جناب! کہئے مزاج تو اچھے ہیں؟ یہ لیجئے کیلے کھائیے۔" باپ نے بیٹے کو کیلے دے دیئے، رشاد لے کر ماں کی طرف چلا۔

ماں بولی ــ "بیٹا ایک کیلا تم لے لو اور باقی اندر رکھ دو اور دیکھو چھلکے صحن میں نہ پھینکنا۔ نہیں تو اس پر پیر پڑ جائے گا اور پھسل جائیں گے نا!"

آج آپ اتنی دیر کو کیوں آئے؟" وہ شوہر سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

آیا کہاں ہوں۔ ابھی پھر جاتا ہوں۔ بھوک کے مارے آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ سوچا ذرا کی ذرا گھر چل کر منہ میں کچھ ڈال لوں۔ جیل قیدیوں کے لئے قید خانہ ہے ہی ہمارے

لیے بھی ایک مصیبت ہے۔"

"تو آج کوئی نیا گل کھِلا؟"

"وہ تو کھِلتا ہی رہتا ہے۔"

"آج کیا ہوا"؟

"میں نے تم کو بتایا تھا۔ وہ جو جھنڈا سنگھ ہے نا قیدی۔"

"جی ہاں جی ہاں! رشاد اس سے بہت مانوس ہے۔"

"ہاں وہی۔ آج اس نے ہڑتال کر دی"

"ہڑتال کیسی۔ کیوں ہڑتال کی اُس نے، وہ تو بڑا شریف قیدی ہے۔"

ہاں ہے تو ایسا ہی۔ مگر عجیب زمانہ آن لگا ہے جس کو ذرا اقتدار مل گیا۔ خدا بن بیٹھا من مانی کرنے لگا جو چاہا حکم دے دیا جو چاہا کرنے لگا۔ ماتحت لوگ کچھ دن تو طرح دے جاتے ہیں لیکن روز روز کی فرعونیت پر جز بز ہونے لگتے ہیں۔"

"یہ آپ کس کے بارے میں کہہ رہے ہیں۔"

یہی جو ہمارے نئے جیلر صاحب تشریف لائے ہیں بالکل فرعون مزاج ہیں۔ آتے ہی خدائی جتانے لگے۔ حکم دیا۔ جب وہ گشت کو نکلیں تمام قیدی ادب سے کھڑے ہو جائیں۔ دو چار روز تو قیدیوں نے ایسا کیا۔ پھر سوچنے لگے۔ یہ نیا قانون کیسا؟ ان کی سمجھ میں تو کچھ نہ آیا مگر عجیب مذاق کیا۔ آج جیلر صاحب گشت کو نکلے تو سب بیٹھے رہے۔ جیلر صاحب یہ حکم عدولی برداشت نہ کر سکے۔ سختی پر اُتر آئے تو جھنڈا سنگھ نے نعرہ لگایا "تانا شاہی......

قیدی جواب میں چیخے...... نہیں چلے گی۔"

میں نے یہ شور سُنا تو دوڑا دوڑا گیا، جیلر صاحب بدحواس دفتر کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے بڑھ کر قیدیوں کو سمجھایا۔ خیر پھر کوئی نعرہ تو نہیں لگا لیکن جھنڈا سنگھ اب کھانا نہیں کھاتا۔ کہتا ہے یہ سرکاری قانون ہی نہیں کہ جیلر صاحب گشت کو نکلیں تو قیدی ادب و تعظیم کے لئے

کھڑے ہو جائیں اور سچی بات بھی یہی ہے جو جھنڈا سنگھ کہتا ہے یہ تو "ہر کہ آمد بنائے نو انداخت" والی مثل ہے۔ جو آتا ہے اپنا حکم چلاتا ہے۔ ہمارے نئے جیلر صاحب نے کسی سے مشورہ کئے بغیر اپنے آپ حکم دے دیا۔ وہ تو کہئے زبانی ہی فرمایا تھا اگر تحریری حکم ہوتا اور روزنامچہ میں درج ہو جاتا تو بکھیڑے میں آجاتے۔ حکم سُن کر پہلے تو یہ سمجھا گیا کہ جیلر صاحب کچھ نئی ہدایات دیں گے۔ ادھر قیدیوں کی ایک مانگ چل رہی تھی۔ انہیں امید تھی کہ ان کا مطالبہ کچھ نہ کچھ پورا ہوا ہوگا۔ شاید جیلر صاحب اس کے متعلق کچھ بتائیں۔ مگر یہاں خدائی کے ڈھنگ ڈالے جانے لگے۔ یہ محسوس کر کے جھنڈا سنگھ کی رگ پھڑکی۔ میں نے تم کو بتایا تھا کہ اس کی رگوں میں راجپوتی خون ہے۔ وہ ڈاکو تو ہے نہیں۔ آزادی سے پہلے رئیس تھا۔ سرکار نے ریاست نکال لی تو وہ ڈاکو بن گیا۔ پھر بھی نرمی سے حکم دو۔ اس کی گردن اُتار لو۔ عزت پر ٹھیس لگاؤ تو جان دے دے گا مگر مان کر نہ دے گا۔ اس نے صاف کہہ دیا۔ "یہ جیل کا سرکاری قانون نہیں، میں نہیں مانتا۔" بس سارے قیدی اس کی حمایت میں ہیں۔ وہ چکی کا اوپر والا پاٹ اٹھائے ہوئے تانے کھڑا ہے۔ کہتا ہے جو میرے پاس آئے گا اس پر دھک دوں گا۔ جیل کے اندر عجیب ہلچل مچی ہے۔ اب جناب جیلر صاحب کا دماغ درست ہوا۔ گھبرا رہے ہیں کہ معاملہ اوپر تک نہ پہنچ جائے اور جواب طلب ہو جائے۔ تم جانتے ہو۔ ایسے نازک موقعوں پر جیل کے خداؤں کو حولدار راشد علی خاں کی یاد آتی ہے۔ میں نے دور کھڑے کھڑے سمجھایا۔ "جھنڈا سنگھ حکم عدولی نہ کرو۔" ڈرایا بھی کہ اس حماقت کے بدلے مہینہ پندرہ دن کی سزا اور بڑھ جائے گی۔ مگر غصے میں وہ کچھ سمجھتا ہی نہیں۔۔۔"

"حولدار صاحب! حولدار صاحب غضب ہو گیا۔" گھبرائی ہوئی آواز کے ساتھ جیل کے چپراسی نے کواڑ کی کنڈی بجائی۔"

"اونہہ سوچا تھا چل کر کچھ کھا لوں۔ آنکھ بچا کر چلا آیا تھا معلوم ہوتا ہے جھنڈا سنگھ نے کسی کو زخمی کر دیا۔"

"ارے کیداری کیا ہوا؟"

"رشاد میاں نہ جانے کیسے قیدی ۸ کے پاس پہنچ گئے۔ اور وہ اس وقت آپے میں نہیں ہے جلدی چلئے۔"

"یا اللہ! یہ احمق وہاں کیسے پہنچ گیا۔" حولدار راشد علی خاں بدحواس ہو کر دوڑے۔

"ابھی تو یہاں تھا۔" ماں پکاری "یا اللہ خیر!" اور مامتا کی ماری رشاد کی ماں بیہوش ہو کر صحن میں گر پڑی۔

حولدار راشد علی خاں صاحب جس وقت جیل میں پہنچے اس وقت جیل کا پورا اسٹاف اور سارے قیدی حیران و پریشان کھڑے عجیب و غریب ڈرامہ دیکھ رہے تھے۔ ننھا رشاد قیدی ۸ کی کمر تک بھی نہ تھا۔ وہ اس کے پاس پنجوں پر کھڑا تھا۔ اس کی نظروں سے نظریں ملائے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "بری بات کھانے سے انکار نہیں کرتے۔ غصہ نہیں کرتے۔ گالیاں نہیں بکتے بُری بات! اللہ میاں ناراض ہوتے ہیں۔ اللہ میاں جو دیں کھالو میری امی کہتی ہیں۔ کھاتے میں روتے نہیں جو ملے شکر کے ساتھ کھالیتے ہیں۔ پھر اللہ میاں اچھی اچھی چیز دیتے ہیں۔ اچھا لو۔ یہ کیلا کھاؤ۔ مجھ پر آنکھیں کیوں نکالتے ہو۔ میں نے کیا کیا؟ بُری بات امیّ کہتی ہیں۔ غصے میں پانی پی لو۔ غصہ جاتا رہے گا۔ یہ بات پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہے۔ جی ہاں پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مانو گے تو جنت ملے گی جنت!...."

اس طرح ننھا جادوگر منتر پڑھ رہا تھا اور چالیس سال کا دیوہیکل جھنڈا سنگھ دھیرے دھیرے مسحور ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی جا رہی تھی۔ اس کے دونوں اٹھے ہوئے ہاتھ ڈھیلے پڑنے لگے۔ آخر اُس نے چکی کا پاٹ ایک طرف ڈال دیا اور ننھے ساحر کی طرف ہاتھ پھیلا کر اُسے گود میں لے لیا۔ منّے منّے ہاتھوں نے کیلا اس کے منہ کی طرف بڑھایا۔ آپ سے آپ اس کا منہ کھل گیا۔ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ پھول کی پتی نے ہیرے کا جگر کاٹ دیا تھا۔ جن شیشے میں اُتر چکا تھا۔

اجتماع

اجتماع اور وعظ و نصیحت سے بچوں کو کیا دلچسپی۔ اللہ میاں نے آدمی کو کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا تو کیا اور گیلی مٹی سے بنایا تو کیا انہیں تو معلوم تھا کہ ملانی بی کے یہاں کچھ نہیں بٹے گا تو پھر وہ کس طرح سنجیدہ ہو کر بیٹھتے ایک ایک کر کے کھسکنے لگے۔ سب مکان کے ایک گوشے میں پہنچے۔ لکڑیوں کے پاس ایک چوہیا بل میں گھس گئی تھی۔ پہلے تو اوپر سے اسے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ نہ نکلی تو پھر کسی نے چمٹا لیا۔ کسی نے نوکیلی لکڑی لی۔ کوئی کہیں سے بغیر دستے کی کھرپی اٹھا لایا اور سب مل کر نل کی جگہ سے ایک نالی بنانے لگے۔ منشا یہ تھا کہ نالی بنا کر پانی بل میں پہنچائیں تب تو چوہیا نکلے گی۔ وہ نالی بنانے میں ناکام رہے تو تھک ہار کر الگ اپنی محفل جما بیٹھے۔ عورتوں کا اجتماع ختم ہو گیا تھا لیکن یہاں بچے اپنی محفل جمائے کھچڑی پکا رہے تھے۔ ان کے درمیان ایک بحث چھڑی تھی۔ کچھ فیصلہ نہ ہو سکا تو طے کیا کہ چل کر ملانی بی سے پوچھیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ اور کپڑے جھاڑے پھر بھی کچھ نہ کچھ گرد برد تھے۔ عورتوں نے بچوں کو اس حال میں دیکھا تو انہوں نے منہ بھی بنائے اور ہنسیں بھی۔ پاس بلانا چاہا لیکن انہوں نے ملانی بی کی طرف جاتے دیکھا تو خاموش رہیں کہ دیکھیں یہ معصوم روحیں کیا کرتی ہیں۔

"دیکھئے تو امی جان! اللہ میاں نے ہم کو مٹی سے بنایا ہے نا؟ رضیہ نے پوچھا۔"

"ہاں رحو! مٹی سے بنایا ہے۔" ملّانی بی نے جواب دیا۔

"لیکن سنیے تو ملّانی بی! پھر مٹی سے اللہ میاں کے ہاتھ سن گئے ہوں گے۔" صفو نے کہا۔ اور ساری عورتیں مسکرانے لگیں۔ سب کو مزا آنے لگا۔

"تو پھر اللہ میاں کی امی جان نے دھلایا ہوگا۔ ہے نا!" سعید میاں نے بھولے پن سے کہا اور سننے والی عورتوں نے اپنے اپنے پلو منہ پر رکھ لئے۔ ہنسی ان کے منہ سے نکلی جا رہی تھی مگر کسی نہ کسی طرح بیٹھی ہوئی تھیں وہ تہہ طوفان کیے ہوئے۔

اور یہ رشاد میاں کہتے ہیں "اللہ میاں کی امی جان ہی نہیں۔" ایک طرف سے گلّو بی نے بڑے تیکھے پن سے کہا۔"

"رشاد میاں تو ٹھیک کہتے ہیں۔" ملّانی بی نے رشاد کی تائید میں کہا۔

"تو پھر اللہ میاں کے ہاتھ کس نے دھلائے ہوں گے؟" ہر بچہ سوالیہ نشان بنا کھڑا تھا اور عورتوں کی یہ حالت تھی کہ ہنسی ضبط کرتے کرتے ان کے پیٹ پھولے جا رہے تھے۔ پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح ضبط کئے ہوئے تھیں۔ اور سوچ رہی تھیں کہ دیکھیں ملّانی بی یہ بات بچوں کو کیسے سمجھاتی ہیں۔ ملّانی بی نے بچوں کو سمجھانا شروع کیا۔

"اللہ کا جسم نہیں ہے۔ نہ تو اس کے ہاتھ ہیں، نہ منھ، نہ سر ہے نہ دھڑ، نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ اس کا کوئی باپ ہے۔ نہ بیوی، نہ ماں، نہ بہن، نہ بھائی وہ تو ایک نور ہے۔ اس نے اپنی قدرت سے سب کچھ پیدا کیا اور۔۔۔۔"

ملّانی بی کی باتوں میں بچوں کو کچھ مزہ نہیں رہا تھا۔ ایک ایک کر کے کھسکنے لگے۔ اپنی اپنی ماں کے پاس پہنچ گئے۔ ملّانی بی چپ ہو گئیں۔ عورتوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

ملّانی بی نے ہمارے لئے کیسی عمدہ تقریر کی۔ ان بچوں کو کوئی سمجھائے تو جانیں۔" پھر سب اٹھ اٹھ کر جانے لگیں۔ ملّانی بی نے مریم کو روک لیا۔ جب سب عورتیں چلی گئیں تو چار بنانے بیٹھیں اور مریم سے اُس ڈرامے کے بارے میں پوچھا جو جھنڈا سنگھ اور رشاد نے کھیلا تھا۔ مریم مسکرائی۔

رشاد سے کہا" جا کر رضیہ کے ساتھ کھیلے"۔ پھر ننھی کے منہ میں دودھ دے کر حال سنانے لگی۔ ملّانی بی نے بڑی توجہ اور دلچسپی سے سُنا۔ پھر کہنے لگیں۔

"راشد بھائی نے تبلیغ کا ایک بڑا اچھا موقع کھودیا"۔

"تبلیغ وہ کیا جاتیں۔ دو ایک باتیں رضیہ کے ابّا سے سُن لیتے ہیں اس کا اثر یہ ہے کہ خدا سے ڈرنے لگے ہیں۔ نہیں تو اس نوکری میں" ابے تبے سے سلام کرنے والے اللہ کا نام لینا کیا جانیں۔ میں اسی کو بہت سمجھتی ہوں کہ وہ نماز پڑھ لیتے ہیں اور آپ سے جو باتیں میں سن جاتی ہوں، انھیں سناتی ہوں تو اللہ کا شکر ہے کہ سُن لیتے ہیں لیکن بہن بتاؤ تو وہاں تبلیغ کا موقع کیا تھا؟"

"دیکھو بہن! جھنڈا سنگھ یہ جانتا تھا کہ یہ سرکاری قانون نہیں ہے بلکہ جیلر نے من مانا قانون لاگو کیا ہے اور پھر اس نے اس کے حکم کو رد بھی کردیا اس وقت وہ اسلامی قانون کی بنیاد بڑی آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔ اسے اس طرح سمجھایا جاسکتا تھا کہ جھنڈا سنگھ! جس طرح اس سرکار کے مقابلے میں ماتحت افسروں کو من مانا قانون بنانے کا کوئی حق نہیں ہے اُسی طرح اس بڑی سرکار یعنی خدا کے مقابلے میں ان چھوٹی چھوٹی سرکاروں کو بھی من مانا قانون بنانے کا حق نہیں ہونا چاہیے جو انسانوں نے اقتدار پاکر بنا رکھی ہے اور خود کو راجہ، نواب اور بادشاہ کہلوا رہے ہیں۔ ہمارا اصل حاکم اور بادشاہ تو اللہ ہے۔ وہی ہمارا مالک اور مولا ہے۔ ہم سب اس کے بندے اور اسی کی رعایا ہیں۔ بندوں کو کیا حق ہے کہ خدا کے مقابلے میں اپنا قانون بنائیں۔ مالک کے حکم کے آگے اپنا حکم چلائیں"۔

"ملّانی بی! کوڑی تو آپ بڑی دور کی لائیں۔ میں یہ سب اپنے حولدار سے ضرور کہوں گی دیکھوں کیا اثر لیتے ہیں....."

"اوں اوں، امی! رشاد میاں نے مجھے مارا"۔ ملّانی بی اور مریم اپنی باتیں چھوڑ کر رضیہ کی طرف دیکھنے لگیں۔ اس کے پیچھے رشاد میاں کھڑے تھے۔ انہوں نے جھٹ کہا۔

"رجو نے مجھے کیوں کہا، اللہ کرے مر جائے ۔"

"تو کیوں میرے اوپر پانی پھینکا تھا!"

میں نے ہاتھ دھو کر جھٹکے تھے چھینٹیں پڑ گئیں ۔

دونوں بچے وکیلوں کی طرح جرح کرنے لگے ۔ مریم چپکی رہی ۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ملّانی بی اس وقت کس طرح ان سے نپٹتی ہیں ۔ ملّانی بی نے ڈانٹا ۔

اچھا چپ ہو جاؤ ۔ میں یہ کچھ نہیں سننا چاہتی کہ رشاد نے رضیہ کو مارا یا رضیہ نے رشاد کو کوسا ۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ تم دونوں لڑے اور لڑائی جھگڑا اللہ کو پسند نہیں ۔ لڑنے والوں سے اللہ میاں ناراض ہو جاتے ہیں ۔ تم دونوں نے آپس میں لڑ کر اللہ میاں کو ناراض کر لیا ۔ جس سے اللہ میاں ناراض، اس سے میں بھی ناراض ۔ چلو بھاگو میرے سامنے سے دور ہو جاؤ اور لو بہن مریم! آؤ ہم تم چائے پیئیں ۔

ملّانی بی کی ڈانٹ پر رضیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ رشاد میاں نے اپنی ماں کی طرف دیکھا لیکن جب اُدھر سے کوئی سہارا نہ پایا تو وہ بھی روہانسے ہو گئے ۔ تھوڑی دیر چپ چپ سے رہے پھر رضیہ کی طرف دیکھا اس نے بھی ان کو دیکھا ۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر دیکھا اور پھر دیکھا ۔ پھر آنکھوں آنکھوں میں کچھ باتیں ہوئیں ۔ نہ جانے ایک نے دوسرے کو اشاروں اشاروں میں کیا کہا کہ رشاد میاں اپنی ماں کی گود میں جا گرے اور بولے "امّی جان اب میں رجّو سے کبھی نہ لڑوں گا ۔"

رضیہ بھی بڑھی اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "چچی جان! میں بھی رشاد میاں سے کبھی نہ لڑوں گی ۔" مریم نے دونوں بچوں کو گلے سے لگایا پھر ملّانی بی سے سفارش کرنے لگیں کہ انہیں معاف کر دیں ۔ ملّانی بی نے کہا "اچھا تم دونوں توبہ کرو ۔ اللہ سے معافی مانگو ۔ اس طرح کہو، اے اللہ! اب ہم کبھی نہ لڑیں گے ۔ ہماری خطا معاف کیجئے ۔

منے منے سے ہاتھ دعا کے لئے اٹھ گئے ۔ جس طرح ملّانی بی نے سکھایا تھا ۔ اُسی طرح

کہا۔ ملّانی بی نے معاف کردیا۔ اس کے بعد دونوں کو پینے کے لئے دودھ دیا۔

تبادلہ

"وعلیکم السلام ، آیئے حولدار صاحب! کہیئے مزاج کیسے ہیں؟"

"الحمدللہ، اچھا ہوں۔"

"اور آپ کے تبادلے کا کیا رہا؟"

"وہ تو رکتا نظر نہیں آتا۔"

"پھر تو آپ کو بڑی پریشانی ہوجائے گی۔"

وہ تو ہوگی ہی۔ وہ علاقہ ہم میدانی باشندوں کو راس نہیں آتا۔ میں اکیلا ہوتا تو کسی طرح جھیل لے جاتا۔ بچوں کو کیا کروں؟ ساتھ لے جاؤں تو وہاں کہاں لے جا کر رکھوں؟ میں سپاہی آدمی نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھروں یہاں چھوڑ جاؤں تو مجھے امید نہیں کہ رشاد وہ رشاد رہ سکے گا جو اب ہے ماشاءاللہ اب گھر سے باہر نکلنے لگا ہے۔ ماں کہاں کہاں پیچھے پھرے گی؟ آپ سچ کہتے ہیں کہ اس عمر میں باپ کی صرف موجودگی کا احساس بچے کی تربیت کے نئے تجدید

مفید ہوتا ہے۔ اس سال اسے کسی اسکول میں داخل بھی کرنا ہے۔ دراصل مجھے سب سے زیادہ رشاد کا خیال ہے ورنہ کوئی بات نہ تھی۔ ماحول جیسا کچھ ہے۔ آپ کی نظر میں ہے۔ اس ماحول میں شیطان بننے کے بہت آسان ذرائع اور بہت زیادہ مواقع ہیں لیکن انسان بننا بڑے دل گردے والوں کا کام ہے۔ بچے تو جیسا دوسروں کو دیکھتے ہیں ویسے ہی خود بنتے ہیں۔

"ٹھیری گڑھوال آپ کا تبادلہ کیا ہوا گویا ایک طرح کی سزا دی گئی۔"

"گویا کیا معنی ضمیر صاحب! سزا تو دی ہی گئی۔"

"یہ کس جرم میں"

"جرم یہ کہ جھنڈا سنگھ مجھ سے مانوس ہو گیا۔"

"مگر اس کا مانوس ہونا تو جیلر کے حق میں مفید ہی ہوا تھا۔"

"وہ پہلے کی بات تھی۔ اب حال یہ ہے کہ سارے قیدی جیلر کے اس اقدام پر ہڑتال کرنے والے ہیں کہ جو قانون سرکاری طور پر ان پر لاگو نہیں، وہ کیوں لادا جا رہا ہے۔"

"یعنی وہی کہ جیلر جب گشت میں نکلے تو سارے قیدی صف بستہ ہو جائیں۔"

جی ہاں اس سلسلہ میں جھنڈا سنگھ کی جھڑپ جیلر سے ہو ہی چکی ہے۔ وہ تو کہیئے رشاد کے بچپنے کی بدولت اس وقت معاملہ رفع دفع ہو گیا لیکن اندر ہی اندر پھوڑا پک رہا ہے۔ جیلر کو مجھ پر شبہ ہے کہ حولدار راشد علی جھنڈا سنگھ کو ابھار رہا ہے۔"

"جیلر کو تو آپ کا ممنون احسان ہونا چاہیئے یا اُلٹے بدگمانی؟"

پہلے تو اس نے رشاد کو بہت پیار کیا تھا۔ مجھ سے بہت خوش ہوا تھا لیکن پھر کھٹک گیا۔"

اصل میں ہوا یہ کہ ایک دن موقع پا کر میں نے آپ کی خدائی قانون والی بات جھنڈا سنگھ کے سامنے دہرا دی۔ میں نے کہا "جھنڈا سنگھ! جیل کے سرکاری قانون میں یہ کہیں نہیں ہے کہ جیلر گشت کے لیئے نکلے تو اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جانا چاہیئے۔ یہ

توجیلر نے من مانا قانون لاگو کرنا چاہا تھا جسے تم نے رد کر دیا۔ لیکن یہ کیا بات ہے کہ سب سے بڑی سرکار کے مقابلے میں چھوٹی چھوٹی سرکاروں کے بنائے ہوئے قانون کو تسلیم کرتے ہو۔ پہلے تو جھنڈا سنگھ سمجھا نہیں لیکن جب میں نے بتایا کہ اصل سرکار تو ایشور کی سرکار ہے۔ یہ دنیاوی سرکاریں تو بے اصل ہیں۔ آج کوئی اقتدار پا گیا اس نے اپنی سرکار بنالی اور اپنا من مانا قانون لاگو کر دیا کل دوسرے نے اس سے اقتدار چھین لیا اور اپنی سرکار بنا بیٹھا۔ تو یہ ساری سرکاریں آنی جانی ہیں ان کے بنائے ہوئے قانون فانی ہیں۔ ہمارا سچا سوامی، ہمارا مالک اور حاکم تو وہ ہے جس نے ہمیں پیدا کیا۔ وہی ہمیں رزق دیتا ہے۔ اس نے ہمارے لئے کیسی کیسی نعمتیں پیدا کیں۔ اب اس کو تم چاہے اللہ کہو یا ایشور یا کسی اور اچھے نام سے یاد کرو ہم سب تو اس کے بندے ہیں۔ بندے کا فرض یہ ہے کہ اپنے مالک کی مرضی پر چلے۔ دیکھو تو جھنڈا سنگھ! یہ سورج اپنے مالک کے بتائے ہوئے قانون پر چل رہا ہے۔ بارش اسی مالک کے لگے بندھے قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ ہوائیں اس کے حکم کی پابند ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس سچے مالک اور حاکم کے قانون سے ہٹ جائے۔ سارے جانور اور چڑیاں اور ہم تم سب اسی کے قانون کے مطابق پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں پھر کیوں نہ ہم انسان اپنے اس ذرا سے اختیار کو بھی اسی مالک کے قانون کے مطابق استعمال کریں جو ہمیں اللہ تعالیٰ ہی نے دیا ہے۔ ورنہ ہم اشرف المخلوقات کیا یوں ہی نام کے لئے ہیں۔

ضمیر صاحب! سچ جانیے، جس وقت میں نے یوں کہا تو جھنڈا سنگھ چونک سا پڑا۔ جیسے اس کے سامنے کوئی بڑا انکشاف ہوا ہو۔ پھر وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ زیادہ وقت نہ تھا۔ میں چلا آیا۔ اس کے بعد اس نے کئی بار پوچھا "حولدار صاحب! خدا کا قانون ہے کہاں؟" میں نے ہر بار یہ مصرعہ پڑھ دیا۔

کوشش کرے انسان تو کیا پا نہیں سکتا

اس دن سے جھنڈا سنگھ میرا بے داموں غلام ہو گیا۔ نہ جانے کیسے میری بات جیلر

تک پہنچ گئی ۔ وہ بدگمان ہے کہ میں درپردہ بغاوت پھیلا رہا ہوں ۔ چنانچہ نزلہ مجھ پر گرا ۔ میں بھی اس ملازمت کی بندشوں سے پریشان ہو چکا ہوں، سوچتا ہوں استعفا دے دوں کیا رائے ہے آپ کی ؟

استعفا دینا کوئی بچوں کا کھیل تو ہے نہیں ۔ زندہ رہنے کے لئے رزق بہرحال حاصل کرنا ہے ۔ کیا آپ نے اس کے لئے کچھ سوچ لیا ہے ؟

" نہیں میرے سامنے کوئی سوچا سمجھا ذریعہ معاش تو نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ رزق کی ذمہ داری اللہ نے لی ہے وہ کسی نہ کسی صورت سے دے گا ہی "

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے خیال میں وہ آپ پر من سلویٰ نازل فرمائے گا ۔ میں اللہ کے رازق ہونے کا یہ مطلب نہیں سمجھتا ۔ اللہ تعالیٰ نے رزق زمین میں پھیلا دیا ہے ۔ ہم کو صلاحیت عطا فرمائی ہے ۔ عقل اور سمجھ دی ہے یہ صحیح ہے کہ رزق خود ہمیں اپنی طرف کھینچے گا لیکن یاد رکھئے ہم آپ انسان ہیں ہمیں بھی رزق کی تلاش کرنا چاہیئے ۔ بھائی ! ہمیں کمانا پڑے گا ۔ جان کھپانا ہوگی تب رزق ملے گا ۔ سمجھے ! یا خدانخواستہ یہ خیال تو نہیں ہے کہ بھیک مانگ کر زندگی بسر کر لیں گے ۔ ظاہر ہے کہ یہ بات نہیں ۔ تو کوئی نہ کوئی حلال ذریعہ معاش تلاش کرنا ہے اور وہ سرِدست سامنے نہیں ہے "

" تو پھر کیا کروں ؟ "

" اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ بچوں کو وطن بھیج دیجئے اور خود جا کر ٹیڑھی گرٹھوال میں پہاڑوں سے سر پھوڑیئے "

وطن یعنی اپنے بھائی صاحب کے گھر ؟ توبہ کیجئے وہاں تو آوے کا آوا بگڑا ہے اس گھر کا ایک نمونہ ڈیڑھ سال پہلے آپ نے اس خاکسار حوالدار راشد علی کو دیکھا تو تھا ۔ ایک کانسٹیبل میں جو برائی ہو سکتی ہے وہ کونسی نہ تھی مجھ میں ۔ وہ تو خدا کا فضل و کرم تھا کہ یہاں آپ کے پڑوس میں جگہ مل گئی ۔ اہلیہ آپ کے گھر سے مانوس ہو گئیں اور مجھے بھی

اپنے مسلمان ہونے کا احساس پیدا ہو گیا۔ ورنہ کیا عرض کروں عجیب ناگفتہ بہ حال ہے ہمارا۔
"پھر تو بڑی سنجیدگی سے سوچنا پڑے گا۔ ایسے موقعوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف زیادہ سے زیادہ رجوع رہنا چاہیئے اور اسی کے بھروسے پر حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا اور وہ ہمارے لئے اچھا ہی ہوگا، چاہے اس وقت ہماری سمجھ میں نہ آئے۔"

دونوں دوستوں میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اچانک ایک لڑکا بائیسکل پر آیا۔ اس نے سلام کر کے گلوگیر آواز میں کہا "چچا جان کا انتقال ہو گیا نمازِ جنازہ نو بجے رات کو ہوگی۔" اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ وہ آنسو پونچھتا ہوا بائیسکل پر پھر بیٹھا اور آگے بڑھ گیا۔

"انا للہ وانا الیہ راجعون" کچھ لمحے سکوت رہا پھر ضمیر صاحب ہی نے اس سکوت کو توڑا "مرحوم بڑی خوبیوں کے انسان تھے اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ مرحمت فرمائے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔"

"آمین! یہ کون صاحب تھے؟۔۔۔"

یہ میرے دوست جمیل احمد صاحب کے چھوٹے بھائی طفیل احمد صاحب تھے۔ میونسپلٹی میں کلرک تھے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ عمر یہی چالیس کے لگ بھگ تھی۔ اللہ کے بندے نے کبھی ایک پیسہ رشوت کا نہیں لیا۔ غریبی میں زندگی کاٹ دی

"پسماندگان میں کون کون؟"

"ایک بیوہ، ایک لڑکا ہے دس گیارہ سال کا۔ اس کے بعد تلے اوپر کی دو بچیاں اور ہیں۔ ایک شاید ۸ سال کی ہوگی اور دوسری ۵ سال کی۔ ایک بچی اور تھی اس کا انتقال ہو گیا۔"

"ان بے چاروں کا ذریعۂ معاش؟"

کچھ نہیں - یا تو جمیل صاحب کے سر کھائیں گی یا خود کمائیں گی - بچوں کی عمریں میں نے بتا دیں - وہ ابھی کس شمار میں ہیں - پڑھنے کی عمر ہے - دیکھئے اللہ کو کیا منظور ہے۔"

"اُف ..... فوہ! بڑا سخت مرحلہ ہے یہ - تین چار بچوں پر اس بیوہ کے ساتھ عقد کرنا کون پسند کرے گا۔"

"آج کل کنواری، خوبصورت اور مالدار لڑکیوں کے لئے اچھے بر تلاش کرنے سے نہیں ملتے - آپ طفیل صاحب کی بیوہ کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔"

"میں سوچ رہا ہوں، ان کی بسر کیسے ہوگی؟ ویسے اللہ تو رازق ہے ہی۔"

"بہر حال زندہ رہیں گی تو رزق ملے گا ہی - کیسے ملے گا؟ یہ میں نہیں جانتا میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شوہر کا انتقال ہوا ہے - رزق دینے والا "حی وقیوم" ہے وہ کوئی نہ کوئی ذریعہ پیدا ہی فرما دے گا۔"

ضمیر صاحب! یہ منطق جو آپ فرما رہے ہیں - بیوہ طفیل کے لئے تو ٹھیک ہے لیکن میں نے جب یہی بات کہی تو آپ نے دوسرے طرز کی گفتگو فرمائی تھی - یہ تضاد میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

تو گویا، آپ عورت بن کر رہنا چاہتے ہیں - حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مرد پیدا کیا - مرد کو اللہ نے عورتوں پر قوام بنایا ہے - مرد کا کام ہے کہ عورتوں کو سہارا دے - انہیں سنبھالے ان کی حرمت کو برقرار رکھے اور ان کے ساتھ زندگی بسر کر کے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرے جو اللہ کی بندگی کا مظہر ہو - رہا آپ کا معاملہ تو آپ کے متعلق میرا خیال ہے کہ لگی ہوئی روزی بے وجہ چھوڑ دینا صحیح نہیں ہے - خیر چھوڑیئے ان باتوں کو، آیئے چلیں جمیل صاحب کے یہاں - یہ بات پھر ہو سکتی ہیں -

کردار سازی

"امی جان! بھوک لگ رہی ہے!"

"پکا تو رہی ہوں!"

"مجھے کچھ دے دیجئے۔"

"پیسے جو دیئے تھے۔ انٹرول میں کچھ لے کر کھایا نہیں؟"

"نہیں امی جان!"

"کیوں نہیں لیا۔"

"امی جان......!"

"کیا پیسے کہیں گرا دیئے؟"

"نہیں امی جان!"

"کسی نے چھین لئے۔"

"نہ، امی جان کسی نے چھینے نہیں ایک ......"

"کیا ایک؟ بتاؤ چپ کیوں ہو گئے ہو؟"

ایک لڑکا، وہ جو ہے نا! کالا کالا۔ ادھر رہتا ہے، وہاں وہ جو مسجد ہے نا! نیم تلے!

میں کیا جانوں۔ نیم تلے کون رہتا ہے۔ بات نہیں بتاتا۔ کیا اس کلوٹے نے چرا لئے۔"

"نہ نہ، یہ بات نہیں، وہ چور نہیں ہے۔ میرے ساتھ پڑھتا ہے امّی!

"اونھ تو تو پہیلی بجھاتا ہے۔ اچھا یہ بتا۔ تیرے پاس پیسے ہیں کہ نہیں؟"

نہیں ہیں امی جان! بات سنیئے......!"

"ہاں بتا بات!"

"بتا تو رہا ہوں امی جان! وہ جو کلوا ہے نا! وہ رو رہا تھا۔"

"کیوں؟ اسے کسی نے مارا تھا۔"

"نہیں امّی جان! وہ بھوکا تھا۔"

"اچھا تو؟"

تو پھر میں نے اُسے پیسے دیئے۔

"یا اللہ! میرا بیٹا اس لئے آج بھوکا رہ گیا۔" مریم نے بیٹے کو گلے سے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں میں ممتا کے آنسو جھلکنے لگے۔ اس نے جھٹ توا چولھے پر رکھ دیا۔ روٹیاں پکانے لگی۔ بیٹے کو باتوں میں لگا لیا۔"

"تو بیٹے! آج کیا پڑھا تم نے۔"

امی جان! آج بڑا اچھا سبق تھا۔ میں نے دل لگا کر یاد کیا۔

"کیا تھا آج کا سبق؟"

"سناؤں سبق امی جان!"

"ہاں سناؤ۔"

"الف سے اللہ کو پہچان - ب سے بسم اللہ کر انسان۔"

واہ وا! ماشاء اللہ رشاد میاں! بہت اچھا سبق ہے - اچھا بتاؤ بیٹے - پوری بسم اللہ کیسے پڑھتے ہیں؟"

وہ تو مجھے معلوم ہے - دیکھئے ابھی جب آپ کھانا دیں گی نا! تو میں پڑھوں گا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - اس کے بعد کھانا کھاؤں گا - امی جان! قاری صاحب نے بتایا کہ بسم اللہ پڑھ لینے سے برکت ہوتی ہے۔"

"برکت کیا؟ برکت کا مطلب تم جانتے ہو؟"

"نہ امی جان یہ تو میں نہیں جانتا"

"تو پھر تم نے قاری صاحب سے پوچھا کیوں نہیں؟"

"ہاں امی جان یہ بات تو رہ گئی۔"

اچھا تو مجھ سے سنو، بسم اللہ پڑھ کر کھانا کھاتے ہیں تو کھانا اچھا لگتا ہے - اللہ اور زیادہ دیتا ہے - بسم اللہ پڑھ کر سبق پڑھتے ہیں تو جلدی یاد ہو جاتا ہے - کوئی کام کرنا ہو، بسم اللہ پڑھ کر کریں تو ٹھیک سے ہو جاتا ہے اور کام میں جی لگتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خوش ہو جاتا ہے سمجھے۔"

"جی!"

ماں بیٹے میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کھانا تیار ہو گیا - مریم نے چاہا کہ رشاد کو کھلا دے - اس نے چٹائی پر دسترخوان بچھایا ہی تھا کہ مغرب کی اذان ہونے لگی - اس نے کہا "بیٹے! اب نماز پڑھ لو پھر کھانا۔"

"جی ہاں امی جان! بعد میں ٹھیک رہے گا۔"

مغرب کی نماز پڑھ کر ماں بیٹے دونوں ایک ساتھ کھانا کھانے بیٹھے - رشاد نے

منھ میں نوالہ رکھتے ہوئے کہا:۔

"امی جان! ابّو میاں کو وہاں کون پکا کر دیتا ہوگا؟"

"بیٹے! کھانے میں دھیان اِدھر اُدھر نہیں لے جاتے۔"

"اور امی جان! آپ نے بتایا تھا۔ کھانا کھاتے وقت روتے بھی تو نہیں۔"

"ہاں بیٹے!"

"پھر آپ ......!"

"نہیں بیٹا! روتی کہاں ہوں۔ یونہی آنسو آگئے۔"

"امی جان! ایک بات پوچھوں؟"

"کیا؟"

"امی جان! وہاں ہوٹل ہیں!"

"کہاں؟"

"کیا نام ہے امی جان! وہ کون سی ٹیڑھی سی جگہ ہے جہاں ابّو گئے ہیں۔"

"اچھا! تم کو ابو میاں یاد آرہے ہیں۔ ہاں بیٹا! ٹہری گڑھوال میں ہوٹل ہیں۔"

"تو ابو میاں وہیں کھاتے ہوں گے؟ ہے نا!"

"رشاد میاں! ابھی میں نے تم سے کہا تھا کہ زیادہ اِدھر اُدھر دھیان نہ لے جاؤ۔"

"امی! ابو یاد آئے جا رہے ہیں۔"

"تو بیٹا میں کیا کروں۔ یاد تو مجھے بھی آتے ہیں۔"

"ابو میاں نہیں ہیں تو جی چاہتا ہے نہ کھاؤں۔"

"بیٹے! کیا چاہتے ہو۔ کیا آج مجھے رُلانے پر تلے ہو کیا؟"

"امی جان! میں آپ کو کب رُلاتا ہوں۔ آپ تو نہ جانے کیوں آنسو...."

"اچھا بیٹے! خاموشی سے کھاؤ۔ نہیں تو میں اُٹھ جاؤں گی۔"

"اچھا امی! اب نہ بولوں گا۔ آپ کھانا کھائیے۔"

ننھا رشاد کھانا کھاتا رہا اور سوچتا رہا کہ ابو میاں کا نام لینے سے امی رونے کیوں لگتی ہیں۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے سوچا یہ بات ملّانی بی سے پوچھے گا۔

کھانے پر بیٹے نے باپ کو یاد کیا تو مریم شوہر کی یاد میں تڑپ تڑپ گئی۔ اس نے لاکھ چاہا کہ یاد ٹل جائے مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ:۔

میں کوشش کر رہا ہوں بھولنے کی مگر وہ یاد آئے جا رہے ہیں۔

"مریم کی حالت یہی تھی۔ پھر تو ——— نہ جانے انہوں نے کھایا ہو یا بھوکے ہی سو رہے ہوں ——— نہ جانے چاء پی کر ہی رات گذار دیتے ہوں۔ وہاں ہوٹل بھی ہوں گے تو یہ کھانا کب ملتا ہوگا۔ پوریاں کچوریاں ہوں گی۔ وہ تو انہیں پسند نہیں۔"

اور اس طرح شوہر کی رہائش، شوہر کی ملازمت، شوہر کے لباس اور پوشاک غرض کہ ایک ایک بات مریم کو یاد آنے لگی اور وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اس کا شوہر پہاڑی مقام پر سخت تکلیف میں ہوگا۔ کھانا تو اس غم کی ماری نے یوں ہی کھایا۔ بیٹے کے ساتھ بیٹھی ٹونگتی رہی۔ پھر جب شوہر کی یاد نے زیادہ ستایا تو بیٹے کو ساتھ لے کر ملّانی بی سے ملنے چلی گئی۔ ملّانی بی کی باتوں سے اس کو بڑا اطمینان حاصل ہوتا تھا۔ رشاد تو رضیہ کے ساتھ الگ جا بیٹھا اور اس کے کھلونوں سے کھیلنے لگا۔ مریم کو ملّانی بی سے معلوم ہوا کہ ضمیر صاحب آج اب تک نہیں آئے۔ ایک آدمی سے کہلوا دیا ہے کہ اسٹیشن گئے ہیں۔ ۹ بجے کی ٹرین دیکھ کر آئیں گے۔"

"کیوں گئے ہیں اسٹیشن؟" مریم کی زبان سے برجستہ نکل گیا۔

"یہ تو کچھ نہیں کہلوایا۔ شاید کوئی ملنے والا آ رہا ہو۔"

"خدا کرے وہ ملنے والا . . . . . !"

"ہاں ہاں کہو بی مریم! شرما کیوں گئیں۔ منہ پر پلّو کیوں رکھ لیا۔ میں دعا کرتی ہوں کہ وہ ملنے والا تمہارا ہی دولہا ہوگا۔"

مُعطّلی

"کہیے حولدار صاحب! آپ نے تحریری جواب بھیج دیا؟"

وہ تو میں بھیجدوں گا اس وقت میں آپ سے یہ مشورہ کرنے آیا ہوں کہ اس معطلی کے زمانے میں رزق کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اگر خدانخواستہ برخاست ہونے کی نوبت آئی تو . . . ؟"

"رزق کا مسئلہ تو پہلے سے حل ہے۔"

"کیا مطلب ہے ضمیر صاحب؟"

میرا مطلب ہے کہ اللہ رازق ہے۔ اس نے جس کو جہاں پیدا کیا ہے، وہیں اس کے لیے رزق بھیجے گا یا رزق تک اسے پہنچائے گا۔ یہ اس کا وعدہ ہے۔ یہ ایک طے شدہ بات ہے اس میں پریشان ہونے کی کوئی وجہ ہی نہیں۔ پریشان ہونے کی بات تو وہ ہے جس کی ذمہ داری اللہ نے ہم پر ڈالی ہے۔

"وہ کیا؟"

وہ یہ کہ آخرت میں انسان اپنے ایمان و عمل کی بنا پر اللہ کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کر سکے گا۔ جو ایمان و عمل سے کورا ہوگا۔ اللہ ہرگز اس سے بات نہ کرے گا۔ حیرت ہے کہ اس طرف سے انسان ایسا غافل ہے جیسے جنت اور دوزخ پر اُسے ایمان ہی نہیں ہے اور رزق جو طے ہے مل کر رہے گا اس کے لئے انسان ایسا بدحواس ہو رہا ہے جیسے اس کا کوئی خدا ہی نہیں۔"

ضمیر صاحب! رزق کے معاملے میں وقتاً فوقتاً آپ کے مشورے کچھ اس طرح کے آتے رہے۔ جو ایک دوسرے سے ٹکراتے معلوم ہوتے ہیں۔ اور اسی لئے میں اس معاملے میں کسی ٹھوس بات پر جم نہ سکا اور اس نہ جم سکنے کا نتیجہ یہ ہے کہ جب میرے رزق پر کسی طرف سے ضرب پڑتی ہے تو۔۔۔۔"

ضمیر صاحب! آپ ذرا ٹھہریئے، مجھے کہہ لینے دیجئے۔ میں خود عرض کرتا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا۔ سوا دو سال قبل جب میں نے یہی بات آپ سے کہی تھی کہ رزق اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ دے گا تو آپ نے کیا جواب دیا تھا اس کے بعد کسی دوسرے موقع پر اس سے کسی قدر ہٹ کر جواب دیا تھا اور آج آپ وہی کہہ رہے ہیں جو میں نے آپ سے عرض کیا تھا۔ یہ ایر پھیر کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

اچھا تو اب پھر سے سمجھ لیجئے۔ بات یہی صحیح ہے کہ اللہ نے جو رزق جس بندے کے لئے مقدر فرما دیا ہے وہ مل کر رہے گا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ رزق خود اللہ کے بندے کو ڈھونڈ رہا ہے۔ بندہ جہاں ہوگا وہیں اس کے پاس پہنچ جائے گا یا بندہ رزق تک پہنچے گا لیکن میں اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جانوروں کی طرح انسانوں تک رزق نہیں پہنچاتا۔ اللہ تعالیٰ اس کے لئے جدّوجہد کرانا چاہتا ہے اس میں اس کی بڑی مصلحتیں ہیں۔ اللہ چاہتا ہے کہ انسان اللہ کے ان خزانوں کو برآمد کرے جو اس نے اپنی اِس دھرتی میں

بھر دیئے اور دنیا میں بکھیر دیے ہیں جانوروں کو اس کا مکلف نہیں کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے دنیا بنائی گئی ہے اس وقت سے کوئی جانور ذرہ برابر ترقی نہ کر سکا۔ اتنا بڑا ہاتھی اتنی بڑی بڑی مچھلیاں، اتنے بڑے بڑے لاٹ کے لاٹ سانپ اور دوسرے بھاری بھرکم جانور اب تک اُسی طرح رہ رہے ہیں جس طرح اب سے ہزاروں برس پہلے رہ رہے تھے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ انسانوں سے مشابہ بن مانس اور انسانوں کی نقل کرنے والا بندر اب تک اُسی جگہ ہے جہاں اب سے ہزاروں برس پہلے تھا۔ آپ نے تاریخ میں کہیں نہیں پڑھا کہ فلاں وقت فلاں بندر یا بن مانس انسان کی طرح باتیں کرنے لگا یا کسی درجے میں انسان بن گیا۔ سائنس دانوں نے کیسا کیسا سر مارا لیکن کسی بندر کو انسان نہ بنا سکے۔ بندر کو کتنا ہی تربیت دے کر ٹوپی اڑھا دیجئے وہ آپ کے ڈر سے کچھ دیر تو اُسے برداشت کرے گا لیکن پھر نوچ ڈالے گا، کیا آپ نے کسی جانور کو دیکھا کہ اس نے اپنی غذا میں کوئی ترقی کی ہو، اپنے لباس کے لیے کوئی چیز اپنائی ہو یا رہائش کے لیے اپنی فطرت سے ہٹ کر کوئی قیام گاہ بنائی ہو لیکن انسان کو دیکھئے۔ اللہ نے اسے اپنی بھری پُری دنیا میں تن تنہا چھوڑا۔ انسان ترقی کرتے کرتے، قدرت کے بھیدوں کو کھوجتے کھوجتے اللہ کی زمین اور اللہ کے سمندروں کو پھاڑتے اور چیرتے ہوئے آج کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے اپنے کھانے کے لیے کیا کیا چیزیں اس نے سمندروں اور زمین سے حاصل کیں۔ لباس کے لیے کیسے کیسے ہر موسم کے مطابق تاگے ایجاد کر کے کپڑے تیار کیے۔ اب وہ کیسے کیسے صحت بخش مکانات بنا کر رہتا ہے اور آمد و رفت کے ذرائع اس نے کہاں سے کہاں پہنچا دیئے۔

حولدار صاحب! یہ تھا وہ کام جس کے لئے اللہ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر زمین پر بھیجا تھا۔ اگر انسان اس کے لیے جدّوجہد نہ کرتا تو وہ اللہ کے سامنے جواب دہ ہوتا۔ اسے اس کی صلاحیت کے استعمال نہ کرنے کی سزا —— دی جاتی —— اور اگر وہ اپنی صلاحیت کو غلط طور پر استعمال کرتا تو بھی پکڑا جاتا —— اور پکڑا جائے گا۔ سنا آپ نے! میں آپ کو اسی غلط استعمال سے بچانا چاہتا تھا۔ میرا مطلب ہر موقع پر یہ تھا کہ اللہ نے جو دے رکھا

ہے اگر وہ حلال ہو تو آپ اس پر لات نہ ماریں۔ آپ خود آزمائش مول نہ لیں لیکن اگر اللہ کی طرف سے آزمائش آئے تو آپ اللہ ہی پر بھروسہ کر کے اُس آزمائش کا مقابلہ کریں اور اللہ ہی سے وہ طاقت اور توفیق طلب کریں جو آپ کو ثابت قدم رکھ سکے۔ رہی آپ کی معطلی والی بات تو سچی بات یہ ہے کہ میں اسی دن کھٹک گیا تھا جب جھنڈا سنگھ کے معاملے میں جیلر نے آپ کو گردان دیا تھا۔ آپ یقین کر لیں کہ اب آپ کے محکمے کے فرعون صفت افسر آپ کو برداشت نہ کر سکیں گے آپ کا تبادلہ اسی وجہ سے ہوا اور معطلی اسی لیے عمل میں آئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب وہ وقت آیا جب کہ آپ برخاست کر دیئے جائیں گے اب آپ کو سوچ سمجھ کر اللہ کی زمین میں رزقِ حلال تلاش کرنا ہوگا۔ وہ آپ کو کہاں ملے گا۔ یہ میں نہیں جانتا لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ مل کر رہے گا۔

رزق خود اڑ کے پہنچتا ہے جو تقدیر کا ہو
پرو دیئے ہیں مرے رازق نے ہر دانے کو

آپ اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ یہ انقلاب جو آپ کی زندگی میں کروٹیں لے رہا ہے۔ اس کے پیچھے اللہ کی کیا مصلحت کام کر رہی ہے۔ یہ وہی جانتا ہے اور آپ یہ بھی یاد رکھیں کہ اللہ جو کریگا اچھا ہی کریگا یہ دوسری بات ہے کہ بندہ بروقت اس کی مصلحت سمجھ نہیں پاتا اور بے صبر ہو کر ہائے واویلا شروع کر دیتا ہے۔ اللہ پر بھروسہ ساری مشکلات کا حل ہے۔ وہ ایسی راہوں سے روزی پہنچائے گا کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے ویسے جہاں تک اللہ نے ہمیں عقل دی ہے اس کے مطابق آپ بھی سوچیں۔ میں بھی سوچ رہا ہوں۔ انشاء اللہ کوئی راہ نکلے گی۔

تبدیلی

ٹھاکرا میں کچھ دنوں سے تم کو بہت ہی بدلا ہوا پا رہا ہوں۔ گھر میں رہتے ہو تو زیادہ تر کسی سوچ میں ہوتے ہو۔ تم نے بات چیت اتنی کم کردی جیسے منھ میں زبان ہی نہیں۔ گھر سے باہر جاتے ہو تو گھنٹے بیت جاتے ہیں اور تمہارا پتہ نہیں ہوتا۔ نہ جانے کہاں جاتے ہو۔ کیا اب کی بار کہیں بہت زیادہ لمبا ہاتھ مارنے کا ارادہ ہے؟ میں کہتی ہوں یہ دھندا کب تک کرتے رہوگے۔ ناتھ! یہ دھندا بڑا گندہ ہے۔ میں تم سے کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ یہ پاپ کی کمائی کھاتے کھاتے میں اکتا گئی ہوں۔ پھر یہ کہ تمہارا ایک پاؤں ہر وقت جیل میں رہتا ہے کوئی رات ایسی نہیں ہوتی جب سپاہی پیادے راتوں کو نہ پکاریں۔ ہر وقت کھٹکا۔ آخر تم کو کب آگا پیچھا سوجھے گا۔ میں تمہارے کارن دکھی رہوں تو چلو مجھے منظور ہے پر اب آشا کا کچھ کرنا ہے۔ یہ بائیس سال کا پہاڑ کہاں لے جا کر پھینکوں۔ ہمارے گھرانے میں اس عمر تک لڑکیاں کب بیٹھی رہتی ہیں۔ تمہارے کرتوت یہ۔ میں کہاں بات ڈالوں۔ پھر زمانہ

یہ لگا ہے۔ تلک ہی میں ہزاروں چاہئیں۔ للّا بھی گیارہویں سال میں ہے۔ وہ بھی دن بھر آوارہ پھرتا رہتا ہے۔ میں کہاں کہاں اس کے پیچھے پھروں۔ میں دیکھتی ہوں کہ وہ بھی تمہاری ہی طرح بنے گا۔ گھر کی بیٹھنے والی۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔ تم گھر رہتے۔ باپ دادا کے زمانے کی زمین نکل جانے پر بھی ابھی اتنی ہے کہ سکھ سے روٹی کھا سکتے ہو۔ اس طرح جیون بتانا کوئی جیون ہے۔ تلنگے تمہارے پیچھے لگے رہتے ہیں پرماتما نہ کرے یہ معلوم ہوتا ہے یا تو تم کسی دن ان کی گولی کا نشانہ بنو گے یا پھر جیل ہی میں سڑ جاؤ گے اور اس جوانی بھری آشا کو میری چھاتی پر چھوڑ جاؤ گے۔ ہائے رام میں کیا کروں!"

گھر والی اس طرح بکتی جھکتی رہی اور ٹھاکر سر جھکائے سنتا رہا۔ کبھی کبھی نظر اٹھا کر اُسے دیکھتا اور پھر جھکا لیتا۔ اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے تھرتھراتے لیکن وہ کسی وجہ سے چپ کا چپ رہ جاتا۔ اس کے اس طرح چپ رہنے سے عورت ذات اور زیادہ جھلّا گئی۔ "ناتھ تم پہلے مجھے گولی مار دو۔ میں نے دل میں ٹھان لیا ہے کہ اب تم اسی وقت گھر سے جاؤ گے جب مجھے سدا کیلئے سُلا دو گے۔ مجھ سے اب یہ پاپڑ بیلے نہ جائیں گے۔ اپنی اولاد اب خود سنبھالو میں جاتی ہوں۔ کنوئیں میں ڈوب مروں گی۔" اور یہ کہہ کر اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اس پر بھی ٹھاکر ٹس سے مس نہیں ہوا تو غریب کمرے میں جا کر چارپائی پر جا گری اور اپنے ماں باپ کو کوسنے لگی کہ کہاں اس کے بھاگ لا کر پھوڑے۔ آشا بیٹھی برتن مانجھ رہی تھی۔ اس نے ماں کو اس طرح دکھی دیکھا تو جا کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور آنسو بہانے لگی۔

ٹھاکر اسی طرح سر پکڑے سوچ میں بیٹھا رہا۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔ اتنے میں للّا دوڑتا ہوا آیا۔ "بابوجی بابوجی! جنگو، بہادر اور کیداری آئے ہیں۔"

"جاؤ ان سے کہدو، میں اس وقت کہیں نہیں جاؤں گا۔"

اور اگر وہ پوچھیں کیوں، تو کیا کہوں؟"

"کہہ دینا، اب میں ان کے کام کا نہیں رہا۔"

"پر بابو جی! وہ کارن پوچھیں گے!"

"ابے لقمان کے باپ جا اُن سے کہہ دے، میں نے اب وہ دھندا چھوڑ دیا۔"

للّا باپ کی گھڑکی سے ڈر کر باہر بھاگا اور پھر باہر ہی باہر اپنے یاروں کے ساتھ جا کر کھیل میں لگ گیا۔

"دھندا چھوڑ دیا!" الٹسواس کھٹواس لیے ہوئے پڑی دکھیاری عورت کے کانوں سے یہ الفاظ ٹکرائے۔ وہ چونک پڑی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ آتنا سے پوچھنے لگی۔ بابو جی نے کیا کہا؟"

"ماں یہی کہا ہے جو تم نے سنا ہے۔ بابو جی آنگن میں سر جھکائے بیٹھے ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ تم انہیں کچھ کہنا نہ کرو ماں!"

"ہے بھگوان دھنیہ ہو! تم نے مجھ دکھیا کی سُن لی۔ پر اب بے سہارا نہ چھوڑیو میرے بھگوان! ان کی بات کا کچھ ٹھیک نہیں۔ بدمعاش پھر آکر گھیریں گے۔ اور وہ چل دیں گے۔"

وہ چارپائی سے اٹھی۔ ٹھاکر کے پاس گئی۔ کچھ دیر کھڑی دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا "روتے کیوں ہو، دل جلی کی بات کا برا مان گئے؟ اچھا چھوڑو ان باتوں کو، یہ بتاؤ کیا سچ مچ تم نے پاپ کی گٹھری اتار پھینکی؟" وہ پاس بیٹھ گئی۔

"ہاں اتار پھینکی۔ آج سے نہیں جب سے جیل سے آیا ہوں تب سے بلکہ یہ پاپ کی گٹھڑی وہیں چھوڑ آیا۔ اب میں وہ نہیں ہوں جو تھا۔ اور دیکھو میں نے تمہاری بات کا بُرا نہیں مانا۔ تم نے جو کچھ کہا میں ویسا ہی تھا۔"

"ایسا؟ مجھے کیا معلوم تھا کہ پتی دیو جیل سے دیوتا بن کر آرہے ہیں۔ میں

یہ جانتی تو پوجا کے لئے تیار رہتی۔“
پوجا کے لائق تو وہ پرماتما ہے جس نے مجھے سیدھی راہ دکھائی۔ میں نے کئی بار چاہا کہ تم کو پوری بات بتا دوں مگر مجھے اپنے اوپر قابو نہ تھا۔ آج بہادر اور کیداری کے آنے پر میں اُن سے نہیں ملا۔ اس میں تمہاری اس نصیحت کا بھی اثر ہے۔ دیکھو اب تم مجھے جب بُری راہ جاتے دیکھنا، میرا ہاتھ پکڑ لینا۔“

”ہاتھ نہیں پیر پکڑلوں گی۔ تم نے میری بکواس کو چھما کر دیا نا۔“

”بکواس نہیں آشا کی ماں! تم نے بہت ٹھیک کہا جو کچھ کہا۔“

”اچھا ایک بات بتاؤ گے، پوچھوں؟“

”پوچھو، کیا پوچھنا چاہتی ہو؟“

”جب تم نے ان سب کا ساتھ چھوڑ دیا ہے تو پھر تم گھنٹوں کہاں غائب رہتے ہو؟“ ———

”تمہارا کیا خیال ہے، میں کہاں جایا کرتا ہوں۔“
اب تک تو میں سمجھتی تھی کہ تم انہی بہادر، کیداری، جگو، جدّھی، ولّر، منگو، خیر و کس کس کا نام لوں، انہی سب کے یہاں جاتے ہوگے اور چپکے چپکے کہیں ڈاکہ ڈالنے کی ٹوہ لگاتے ہوگے پر اب بات کچھ اور ہے۔ اب تم کہیں اور جاتے ہو۔ یہ میرا من کہتا ہے۔“ ———

”ہاں اب میں، ایک دوسری جگہ جاتا ہوں۔“

”وہ کہاں۔“

”وہ جگہ جاننے کے لئے تم کو ذرا صبر سے کام لینا ہوگا۔ پھر کبھی بتا دوں گا۔“

”اچھا، میں ضد نہیں کرتی لیکن ایک دوسری بات پوچھتی ہوں کیا اب کی بار جیل میں سختی زیادہ اٹھانی پڑی جس سے گھبرا کر تم نے یہ دھندا چھوڑنا طے کیا؟“

نہیں، مجھ پر جیل میں سختی کون کرسکتا ہے۔ جیلر میرے نام سے کانپتا تھا لیکن ایک دن ایک ننھا سا دیوتا آیا۔ اس نے میرا ہردے الٹ دیا۔ پھر وہیں میرا ایک دوست پیدا ہوگیا۔ اس دوست نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ میری آنکھیں کھلنے لگیں۔ مجھے کچھ سے کچھ نظر آنے لگا لیکن میں جو کچھ دیکھنا چاہتا ہوں وہ اب تک نہ دیکھ سکا، جو کچھ سمجھنا چاہتا ہوں، وہ نہ سمجھ سکا۔ جو کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں، وہ نہ پا سکا، ہاں مجھے امید ہے کہ بھگوان مجھے سیدھی راہ پر ضرور لے آئے گا۔"

"پرماتما ایسا ہی کرے۔ ذرا اس دوست کی کچھ باتیں تم مجھے بھی سناؤ۔"

سنو، ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا۔ اس سنسار کی رچنا کس نے کی؟"

میں نے کہا "خدا نے" اس نے پھر پوچھا اس سنسار کی ساری چیزیں کس نے بنائیں میں نے کہا "خدا نے" اب اس نے سوال کیا "تو پھر یہ سارا سنسار اور جو کچھ اس میں ہے کس کا ہونا چاہیئے۔" میں نے کہا "اسی خدا کا" میرے دوست نے جب مجھ سے یہ کہلوایا۔ اچھا یہ بتاؤ آشا کی ماں! میں نے ٹھیک ٹھیک جواب دیا۔ نا!"

"بالکل ٹھیک جواب دیا تم نے!"

"اچھا جب اس نے یہ کہلوایا تو کہنے لگا" تو پھر وہی خدا ہمارا مالک ہوا اور ہم اس کے بندے اور داس ہوئے؟"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک" اب میرا دوست کہنے لگا جب ہم اس کے بندے اور داس ہیں تو ہمارا کام ہے کہ اسی کے حکم پر چلیں۔ وہی کچھ کریں جو مالک کہے۔ ہمارا کرتویہ اور فرض ہے کہ اس مالک کو خوش رکھیں۔ کیوں نا! آشا کی ماں!!"

"بالکل ٹھیک کہا تمہارے دوست نے۔ پھر؟"

پھر اس نے عجیب و غریب بات کہی اور اس طرح کہ میرے دل میں اتر گئی۔ کہنے لگا کہ اس مالک نے دنیا کی ہر چیز کے لیے ایک قانون اور قاعدہ بنا دیا ہے۔ دنیا کی

ہر چیز اسی قانون میں جکڑی ہے ۔ مجال نہیں کہ اس مالک کے طریقے سے ذرہ برابر ہٹ جائے ۔ سورج اسی کے بنائے ہوئے راستے پر اسی طرح چلتا ہے جس طرح مالک نے حکم دیا۔ سورج کی مجال نہیں اس راستے سے انچ برابر ہٹ جائے چاند کو دیکھو، اس کے لئے بھی ایک قانون اور قاعدہ موجود ہے ۔ دنیا کی جو چیز ہے، چاہے وہ دکھائی دے یا نہ دے اسی کی مرضی کے مطابق اپنے اس کام میں لگی ہے جس کے لیے مالک نے اُسے پیدا کیا ۔ تم آنکھ سے سننے کا کام نہیں لے سکتے، تم منھ سے سوچنے کا کام نہیں لے سکتے ۔ کانوں سے سُن ہی سکتے ہو ۔ کھا نہیں سکتے ۔ پھر یہ کام کہ ہر چیز کے پیدا ہونے اور فنا ہونے، تم سمجھیں فنا ہونے کا مطلب یعنی مر جانے اور نشٹ ہو جانے کا جو قانون اس نے بنا دیا اسی قانون کے تحت ہر چیز پیدا ہوتی اور فنا ہوتی ہے ۔ تو جب اس خدا نے دنیا کی ہر چیز کے لیے ایک نہ ایک قانون بنا دیا تو کیا وہ ہم انسانوں کے لئے کوئی قانون نہ بناتا کیا وہ انسانوں کو یونہی اس دنیا میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا سنتی ہو آشا کی ماں کیسی سچی بات کہی اس نے؟"

"بات تو ٹھیک معلوم ہوتی ہے پھر تم نے کیا کیا؟"

"میں کیا کہتا ۔ میں نے کہا، وہ قانون کہاں ہے ۔"

"تمہارے دوست نے بتایا؟"

"بولا ۔ اس کا قانون خود تلاش کر لو ۔"

"تم اس مالک اور سوامی کا قانون تلاش کر سکے؟"

"یہ تم کیوں پوچھتی ہو؟"

"اس لیے کہ اگر وہ مل جائے تو ہمیں اس کا پالن کرنا چاہیئے ۔"

"افسوس ابھی تک میں کامیاب نہیں ہوا لیکن ملنے کی آشا پیدا ہوتی جا رہی ہے ۔ اگر بھگوان کی دیا اسی طرح رہی تو میں وہ قانون حاصل کر کے رہوں گا ۔"

"تو مجھے بھی بتانا!"

"ضرور ۔"

"بابوجی! مجھے بھی بتانا!" آشا نے کہا۔
"ضرور ضرور!" ٹھاکر نے دونوں کو اطمینان دلایا۔

فکرِ معاش

دیکھئے حولدار صاحب! ایک ایک مسئلے پر غور کیجئے۔ پہلے رشاد کے بارے میں سوچیئے۔ میری رائے یہ ہے کہ اب آپ اس کا نام اسکول میں لکھا دیں۔"

"اسکول سے مطلب یہ کہ اُسے میں سرکاری اسکول میں داخل کرا دوں؟"

"جی ہاں"۔

مگر وہاں طالب علم جو کچھ بنتا ہے وہ تو آپ کے سامنے ہے آج کل کے ہنگاموں میں طلبا نے جو پارٹ ادا کیا اور کر رہے ہیں۔ اس سے انسانیت کو کوئی لگاؤ ہے؟ کیا میں رشاد کو اُسی آگ میں جھونک دوں۔"

ٹھہریئے! ذرا سنجیدگی سے سوچیئے۔ آپ کی ہنوز کوئی مستقل آمدنی نہیں۔ مُعطلّی کا زمانہ آپ گذار رہے ہیں۔ روزگار ابھی زیرِ غور ہی ہے اس حال میں اگر میں آپ کو یہ مشورہ دوں کہ اُسے کسی ایسے مدرسے میں تعلیم کے لئے بھیج دیجئے جہاں دینی تعلیم اور اسی کے

مطابق تربیت دی جاتی ہے تو اول تو میری نظر میں کوئی ایسا مدرسہ نہیں اور اگر آپ کہیں ایسا مدرستہ الاصلاح یا مدرستہ الفلاح، ندوۃ العلوم یا دار العلوم ڈھونڈھ بھی لیں تو اس کا خرچ آپ برداشت بھی کر سکیں گے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ بچے کو آپ اپنی نظروں کے سامنے رکھئے۔ یہاں مکتب میں وہ قاری صاحب سے دینی تعلیم تو حاصل ہی کر رہا ہے۔ قرآن کا ناظرہ اس نے ختم کر لیا ہے۔ یہاں تو وہ عقائد اور اسلامی آداب سیکھتا رہے اس کے علاوہ سرکاری اسکول میں وہ کچھ پڑھے لکھے جو وہاں پڑھایا جاتا ہے۔ اب رہا یہ کہ سرکاری اسکول کی تعلیم سے غیر دینی رجحانات کا اثر بچے پر پڑے گا۔ ان سے بچانے کے لیے آپ یہ کریں کہ اپنے اوقات میں سے صرف ایک گھنٹہ آپ اس لیے نکالیں کہ اس گھنٹہ میں آپ بچے سے اسکول کا آموختہ سُن لیا کریں۔ آموختہ سننے کے دوران وہ تمام باتیں آپ نوٹ کریں گے جو ہمارے رویے سے ہٹی ہوئی ہوں گی آپ بچے کو بتائیں کہ یہ بات ایسی اور یہ ایسی ہے۔ اگر آپ ہر روز ایک گھنٹہ اس کیلئے وقف کر دیں تو آپ کا بچہ کم عمری ہی میں اچھا خاصہ نقّاد بن سکتا ہے اور مجھے رشاد کی ذہانت سے یہی امید ہے۔ آخر ہم رشاد کو اسی میدان میں چھوڑ کر ان رجحانات و نظریات سے لڑنے کے لئے کیوں نہ تیار کریں جو اسی میدان کی پیداوار ہیں ویسے میں تو رشاد اور رضیہ کو گھنٹہ آدھ گھنٹہ پڑھاتا ہی ہوں۔"

"نہایت صائب رائے ہے آپ کی۔ اب یہ فرمایئے کہ میں کیا کروں؟"

"آپ کے متعلق میں نے معاش کے حاصل کرنے کے دو ذرائع سوچے ہیں۔ ایک ذرا دیر طلب ہے اور آپ کو اسی وقت آمدنی کی ضرورت ہے تو آپ وہ ذریعہ اختیار کریں جس سے فوری طور پر کچھ نہ کچھ آمدنی ہونا شروع ہو جائے۔"

"فرمایئے میں تیار ہوں۔"

"پہلے تو آپ یہ بتایئے کہ حلال پیشوں کے ذریعہ حلال کمائی حاصل کرنے میں آپ کو جھجک تو نہیں ہوگی؟"

"کیا مطلب؟ ذرا وضاحت فرمائیے ضمیر صاحب!"

مثلاً اگر میں یہ مشورہ دوں کہ پانوں کی دُکان کرلو، پھل بیچنا شروع کردو یا کوئی اور پیشہ اختیار کرلو۔ حولدار صاحب! یہ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ آپ ٹھہرے خاں صاحب! اب تک ہم آپ پیشوں کو ذلیل سمجھتے رہے۔ اب تک ہماری زندگی کا دارومدار ملازمت پر رہا۔ ملازمت تو آپ سمجھئے کہ گئی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس مُعطّلی کا کیا ہو۔ تو پھر کیوں نہ ہم پیشوں کی طرف توجہ کریں یا گھر پر کوئی چھوٹی سی دُکان رکھ لیں۔"

ضمیر صاحب! آپ نے پکڑی تو زبردست لیکن آپ کی صحبت سے میں نے جو کچھ اسلام کو سمجھا ہے اس کی بنا پر اب میں پیشوں کو ذلیل نہیں سمجھتا جب کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال پیشوں کے کرنے کی ترغیب دی ہے اور تجارت کے بارے میں تو بہت بڑی بات فرمائی ہے۔ بشرطیکہ ہم ایمانداری کے ساتھ کرلے جائیں۔ وہ کیا حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے کلمہ کی انگلی اور اُس کے پاس والی انگلی اُٹھا کر فرمایا کہ ایماندار تاجر جنت میں میرے اتنا ہی قریب ہوگا جتنا قریب یہ دونوں انگلیاں ہیں"

ماشاءاللہ! آپ کا ذہن کافی حد تک سنور گیا ہے۔ تو پھر اب سنیئے، میں نے سوچا ہے کہ آپ بائیسکلوں کے چار پُرانے پہیوں سے ایک چھوٹا سا ٹھیلہ بنوالیں۔ اِس ٹھیلے پر کچھ کوئلہ رکھ لیں۔ ایک استری رکھ لیں اور راستہ گلی یہ آواز لگانا شروع کردیں "دُھلے کپڑوں پر استری کرائیے۔" اس طرح ایک دن، دو دن تین دن چکر لگانے سے لوگ آپ کو جان جائیں گے۔ پھر وہ اپنی مستورات سے کہیں گے۔ مستورات گھروں میں کپڑے دھوتی رہتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ گھر کے بڑے کپڑوں کو استری کرکے استعمال کریں۔ اگر آپ یہ خدمت قلیل اُجرت پر شروع کردیں تو انشاءاللہ پہلے ہی دن سے آمدنی ہونے لگے گی۔ آپ بھوکے نہیں رہیں گے آگے اللہ مالک ہے۔"

"آپ نے سوچا......"

ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی۔ یہ پیشہ جو میں نے آپ کے لیے سوچا ہے اس کی ایک غرض بھی ہے۔ اس طرح گلیوں گلیوں چکر لگا کر آپ ایک کام اور کریں گے۔ آپ کو یاد ہوگا۔ اب سے دو تین سال پہلے طفیل احمد صاحب کی بیوہ کے متعلق آپ نے یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ اس بچاری کی معاش کا کیا ہوگا؟ یاد ہے نا! میری نظر میں ایسی نہ جانے کتنی بیوائیں ہیں جو پریشان ہیں نہ تو ان کی شادی ہوتی ہے اور نہ ان کی معاش کا کہیں ٹھکانہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کپڑوں پر استری کرنے کے ساتھ ساتھ یہ سروے بھی کر ڈالیں کہ اس میں کتنی بیوائیں ہیں اور دیکھئے، اس میں مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز نہ برتیے گا۔ سب کے نام اور پتے لکھ کر ایک رجسٹر ترتیب دے لیجئے۔ جب آپ یہ سروے کر لیں تو پھر میری یہ تجویز ہے کہ ان کے لیے کپڑوں کے سینے کا کوئی نظم سوچا جائے۔ کیا یہ جائے کہ کرتے قمیص پاجامے، شلوار جمپر اور ایسے ہی کپڑے ہماری معرفت سے سینے کے لیے ان بیواؤں کو دیئے جائیں۔ درزی اگر اُجرت ایک روپیہ لیتا ہے تو ہم اخبار کے ذریعہ یہ اعلان کریں کہ دس آنے یا بارہ آنے میں سلا کر دیں گے اور اسکیم کا تعارف بھی اخبار میں دے دیا جائے کہ غرض ان بیواؤں کی امداد ہے۔ میرا خیال ہے کہ مسلم اور غیر مسلم تمام شریف طبقہ ہم سے تعاون کرے گا اور ہم بلا امتیاز مذہب و ملت قوم کی وہ خدمت کر سکیں گے کہ اللہ بھی ہم سے خوش ہوگا اور پبلک بھی ہمیں سر آنکھوں پر بٹھائے گی۔ اب کہئے، کیا کہنا چاہتے تھے آپ۔"

میں نے دخل در معقولات کچھ اور کرنا چاہی تھی مگر اب کچھ اور کہنا چاہتا ہوں۔ یہ تو بتائیے کہ سلائی کی مشینیں کہاں سے آئیں گی۔"

ایک مشین آپ کے گھر میں ہے۔ ایک میرے گھر میں ہے اسی طرح بہت سی عورتوں کے پاس مشینیں ہیں پہلے ایسی ہی بیواؤں کو کام دیا جائے۔ رہیں وہ غریب بیوائیں جن کے پاس مشینیں نہیں ہیں، ان کے لیے کوئی اور انتظام سوچا جائے گا۔ اُدھار بھی تو قسطوں پر ملنے کا طریقہ چل پڑا ہے۔"

بہت مناسب ہے آپ کی اسکیم۔ میں اس تجویز کی خاطر وہ پیشہ بھی اختیار کر لوں گا جو فی الحال میرے لیے تجویز فرمایا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ایک دو دن "صدا" لگانے میں جھینپ ہوگی پھر لوگ خود سمجھ جائیں گے۔"

میں بتاؤں، آپ ایک کام اور کریں۔ اپنے ٹھیلے پر ایک گھنٹی لٹکالیں جب آپ ٹھیلہ لے کر چلیں گے تو گھنٹی خود بجے گی، اور پھر لوگوں میں سے ——— کوئی آپس ہی میں پوچھے گا کہ یہ کون آرہا ہے تو انہی میں سے کوئی جواب دے گا کہ وہی آرہے ہیں۔ گھنٹی آپ کی "صدا" کا کام دے گی۔ بچے گھروں سے نکل کر گھنٹی کے بجنے کا منظر دیکھیں گے اس کے بعد ہر لڑکا گھر جا کر اپنی امی سے آپ کا تعارف کرائے گا۔"

"ہاں گھنٹی تو ضروری ہے۔ ورنہ کوئی چیخے گا کہاں تک۔"

"تو پھر یہی طے ہو گیا نا!"

"جی بے شک۔"

"کب سے آپ استری کرنا شروع فرمائیں گے۔"

آج ہی میں کباڑ خانے سے بائیسکل کے پہیے خرید لوں گا۔ کل ٹھیلہ بن جائے گا۔ پرسوں خدا کا نام لے کر نکل کھڑا ہوں گا خدمت اور محنت کرنا میرا کام ہے۔ روزی پہنچانا خدا کا۔"

جزاک اللہ! اب سمجھے آپ! اچھا جب پرسوں آپ اس خدمت کے لیے نکلیں گے تو کل کے اخبار میں آپ یہی اعلان کرادیں کہ فلاں تاریخ سے آپ اپنے کپڑے دھو کر سکھا رکھیے۔ ہم آپ کے گھر پہنچ کر ان پر استری کر دیں گے اور اُجرت فی کپڑا دس پیسے اور بڑوں کے بیس پیسے۔

"جی ہاں، اتنے پر سب ہی عورتیں راضی اور خوش رہیں گی۔"

"اچھا تو اللہ آپ کو مبارک کرے۔"

"تو جا کر رشاد کی والدہ سے یہ ساری باتیں بتا دوں۔"

ضرور ضرور یعنی دونوں تجویزیں۔ بیواؤں کی خدمت والی تجویز پر دیکھئے۔ وہ بہت خوش ہوں گی۔"

"اللہ مالک ہے۔"

"اچھا تو یہ صحبت برخاست۔"

"جی ہاں اب اجازت دیجئے۔"

"السلام علیکم"

"وعلیکم السلام"

بھائی کی آمد

حولدار راشد علی خاں دو تین دن سے بہت خوش نظر آرہے تھے۔ ان کے بڑے بھائی جناب مرشد علی خاں صاحب کا خط لکھنؤ سے آچکا تھا۔ لکھا تھا کہ وہ جمعہ کو مع اہل وعیال بریلی پہنچ رہے ہیں۔ مرشد علی خاں صاحب حولدار راشد علی خاں صاحب سے بیس برس بڑے تھے۔ راشد علی خاں صاحب دس برس کے تھے، اس وقت والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ مرشد علی خاں صاحب نے چھوٹے بھائی کو اپنی تربیت میں لے لیا۔ انہوں نے بھائی کو تع دلائی۔ ہائی اسکول تک پڑھانے کے بعد نوکری دلادی۔ اس کے بعد شادی کر کے گھر بھ بسا دیا۔ اس محبت اور شفقت نے بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی کی نظر میں اس درجہ محتر بنا دیا تھا کہ حولدار راشد علی خاں جب ان کے سامنے جاتے تو ان تمام آداب کا پورا پورا لحا رکھتے۔ جن کے وہ مستحق تھے۔ پھر یہ کہ عرصے سے دونوں بھائی ایک دوسرے سے مل بھی سکے تھے۔ چھ برس ہو چکے تھے جب حولدار راشد علی خاں گھر گئے تھے، ایک مہینہ بھائی کے

پاس رہ کر آئے تھے اس وقت سے اب تک خطوط ہی نصف ملاقات کا ذریعہ بنے رہے اس طرح طویل مدت میں بھائی نے بھائی کو دیکھا نہیں تھا۔ چنانچہ نظروں میں بڑے بھائی کا احترام اور دل میں شوقِ ملاقات ان دونوں "قدروں" نے مل کر راشد علی خاں کی خوشی میں وہ نمایاں اضافہ کر دیا تھا جسے دیکھنے والے دیکھتے تھے اور اس نئی روشنی کے دور میں حیرت کرتے تھے۔

خط آنے کے بعد راشد علی خاں نے اپنا کام اپنے ان معاونین پر چھوڑ دیا جن کو با اُجرت رکھ لیا تھا۔ وہ بھائی کی آمد کی خوشی میں گھر کی صفائی اور اسے آراستہ کرنے میں لگ گئے۔ انہوں نے بڑی سادگی لیکن پُرکاری سے گھر کو جاذبِ نظر بنا دیا۔ جس گھر میں وہ رہ رہے تھے اس میں دو کمرے تھے۔ ان میں سے ایک بڑے بھائی کے لیے خاص کر دیا۔ اس میں ضرورت کا سامان قرینے سے لگا دیا۔ وہ اپنے بھائی کے اس درجہ ممنون تھے کہ ان کی تواضع کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا دینے کو بھی اپنی بڑی سعادت مندی سمجھتے تھے۔ گھر کی ایک خاص شخصیت کی آمد نے گھر بھر کو استقبال کے لیے تیار کر دیا تھا۔ حولدار صاحب کی اہلیہ اپنی جٹھانی کی خاطر و مدارات کے منصوبے بنا رہی تھیں اور رشاد اپنے چچازاد بھائیوں اور بہنوں کے تصور میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے بھی اپنے "ہوم ورک" کی جگہ کو اپنے مذاق کے مطابق سجایا تھا۔ پڑھنے لکھنے کا سامان ایک طرف اور کھیلنے کا ایک جگہ، آرٹ و کرافٹ کے نمونے اس نے سامنے دیوار اور اس کی کارنس پر لگا رکھے تھے۔ اس مضمون میں اس کی اسلامی ذہنیت نے عجیب و غریب کرشمے دکھائے تھے۔ اسکول میں آرٹ و کرافٹ کے تحت جو کچھ اُسے بتایا جاتا تھا اس میں اُسے سب سے زیادہ دلچسپی ڈرائنگ سے تھی۔ اس نے اپنے ذوق سے لفظ "اللہ" اور "محمد" کو مختلف رنگوں میں اسپرے کیا تھا اور آرٹ کے نمونوں میں اُس کو سب سے اونچی جگہ سجایا تھا اس نے چار مربع انچ کے ایک چکنے پیپر پر مختلف رنگوں میں ایک ایسی گھڑی بنائی تھی کہ دو انچ میں تو گھڑی تھی اور اس کے آس پاس جو جگہ بچی تھی اس میں اپنا دن

بھر کا ٹائم ٹیبل لکھا تھا۔ ٹائم ٹیبل بنانے میں اس نے گھنٹہ اور منٹ کی سوئیوں کے سامنے تقسیم کار درج کی تھی۔ اس ٹائم ٹیبل کو وہ اپنی چھوٹی سی میز پر شیشے کے ایک فیٹ کے ٹکڑے کے نیچے رکھتا تھا۔ اسی کے مطابق وہ ہوم ورک کرتا، نماز پڑھتا اور اپنے دوسرے مشغلوں میں لگا رہتا تھا۔ ایک بار ضمیر صاحب نے اُس کے اس ٹائم ٹیبل کو دیکھ کر بڑی تعریف کی تھی اس لیے اس کی قدر رشاد کی نظر میں بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ اُسے بہت عزیز رکھتا اور اس اندیشے سے کہ یہ شئے لطیف ہاتھ سے بے ہاتھ ہو جائے، کسی کو ذرا دیر کے لیے بھی مانگے نہ دیتا تھا اپنے چچازاد بھائی ارشد علی خاں کا نام خطِ گلزار میں لکھا تھا اور اُسے فریم بھی کرا لیا تھا۔ یہ نمونہ رشاد نے اپنی چھوٹی سی میز کے سامنے لگایا تھا۔ وہ اپنے "ارشی" بھائی کو اس وقت دیکھ چکا تھا۔ جب وہ چھ برس کا تھا۔ خطِ گلزار کا یہ کتبہ اس نے ارشی بھائی کو تحفہ دینے کے لیے تیار کیا تھا۔ جب وہ اپنے ابا جان کے ساتھ لکھنؤ گیا تھا اس وقت اس کی چچازاد بہن رشیدہ چار برس کی تھی۔ پھر ایک خط سے یہ معلوم ہوا تھا کہ اللہ میاں نے اس کے بڑے ابا کے گھر ایک گڑیا اور بھیجی ہے۔ رشاد اپنے بھائی بہنوں کے قدوقامت کا اندازہ لگا رہا تھا۔ "ارشی بھائی اب اتنے بڑے ہوں گے، رشو اتنی بڑی ہوگی اور ننھی گلو؟ ارے وہ تو گلاب کی طرح ہوگی۔" آخری فقرہ بے خبری میں اس کی زبان سے نکل گیا ماں اس وقت ٹی سیٹ نکال رہی تھی۔ اس نے رشاد کی طرف دیکھا۔

"کون گلاب کی طرح ہوگا بیٹے؟"

ماں کے اس سوال پر رشاد چونک پڑا۔ ماں کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔

"امی جان! گلو تو ایسی ہوگی جیسے گلاب کا پھول۔"

"اچھا، تم کو وہ سب یاد آرہے ہیں!"

"رشو تو اب خوب پڑھنے لگی ہوگی اور ارشی بھائی تو۔۔۔۔!"

ہاں بیٹے! ارشی اب بڑا ہو گیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو جمعہ کی نماز کے بعد

ہم ان کو لینے اسٹیشن چلیں گے!"

امی جان! میں بھی اسٹیشن جاؤں گا۔ بڑے ابا کو لینے۔"

"بڑے ابا کو لینے یا ارشی اور رشو کو؟"

ماں نے بیٹے کی رگِ شوق پر انگلی رکھ دی تھی۔ رشاد کو دل میں گدگدی محسوس ہوئی وہ مسکرایا۔

ماں کی ہدایات کے مطابق اس نے اسٹیشن جانے کی تیاری شروع کر دی اس نے اپنی وہ شیروانی پہن رکھی تھی جو عید میں بنی تھی۔ رام پور کی مخملی ٹوپی اس کے سر پر تھی۔ آج اس نے ماں کے اصرار پر سرمہ بھی لگایا تھا۔ اس کی ماں نے منی کو بھی نہلا دھلا کر فراک وغیرہ پہنا دیا تھا ضمیر صاحب کے یہاں کہلا دیا تھا کہ آج شام کا کھانا وہ سب یہیں کھائیں گے اور رضیہ کی والدہ کو تاکید کر دی تھی کہ وہ ٹھیک ایک بجے آجائیں تاکہ گھر ان کی نگرانی میں چھوڑ کر خود آنے والوں کے استقبال کو اسٹیشن جا سکے۔

حولدار راشد علی نے جمعہ کی نماز محلے کی مسجد میں ایک بجے پڑھ لی اس کے بعد ڈیڑھ بجے ایک تانگے پر لد کر بیوی بچوں کے ساتھ اسٹیشن جا پہنچے۔ اسٹیشن پر وہ دو بجے سے کچھ منٹ پہلے پہنچے تھے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ٹرین آدھ گھنٹہ لیٹ ہے۔ آدھ گھنٹے کا یہ وقفۂ انتظار ان سب کے لیے بہت گراں گزرا۔ گرانی کی اس کوفت کو کم کرنے یا بھلانے کے تئیں حولدار صاحب نے ایک اخبار لے لیا اور اُسے پڑھنے لگے۔ رشاد کو اس کا ایک ساتھی مل گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ پلیٹ فارم کی سیر کرنے چلا گیا۔ رشاد کی والدہ منی کو لے کر ایک طرف بیٹھ گئیں۔

حولدار صاحب اخبار پڑھ رہے تھے کہ اچانک کان میں آواز آئی" وہ گاڑی" اس کے بعد گھڑ گھڑاہٹ بھی سنائی دی اور اسی کے بعد ایک عورت چیخی" ہائے رام میرا لعل" اور پھر ساتھ ہی ایک شور مچ گیا۔ حولدار صاحب شور سُن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"دیکھئے تو رشاد کہاں ہے؟" رشاد کی ماں نے گھبرا کر کہا۔ حولدار صاحب ایک

طرف دوڑ پڑے ۔ وہ دس بارہ گز ہی گئے تھے کہ گاڑی پلیٹ فارم پر آ گئی ۔ شور کرنے والوں کی بھیڑ یک دم پیچھے ہٹ گئی ۔ اس وقت حولدار صاحب نے جو کچھ دیکھا اس سے ان پر ایک ہیبت اور وحشت طاری ہو گئی ۔ رشاد ایک مُنّے سے بچے کو پکڑ کر لائن کے دوسری طرف لے جا رہا تھا پلک جھپکتے رشاد اور پلیٹ فارم کے درمیان ٹرین آ کر کھڑی ہو گئی ۔ حولدار صاحب نے دیکھا کہ ایک دیہاتی عورت بوکھلائی ہوئی "ہائے رام ہائے رام" چیخ رہی ہے ۔ ایک گنوار آدمی اُسے پکڑے ہوئے تھا ۔ حولدار صاحب نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ایک ڈبے کے اندر سے گذر کر دوسری طرف رشاد تک پہنچ جائیں اور دیکھیں کہ اس پر کیا بیتی ۔ لیکن ٹرین پر رش اتنا تھا کہ الامان والحفیظ ۔ چڑھنے اور اُترنے والے مسافروں میں بلا کی کشمکش ہو رہی تھی ۔ حولدار صاحب کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے ۔ اتنے میں بیوی منی کو گلے لگائے ہوئے آئیں ۔ انہوں نے حولدار صاحب سے "میرا رشاد" اس طرح کہا جیسے خدانخواستہ رشاد گاڑی کی زد میں آ گیا ہو ۔

"خدا کو یاد کرو! میں ابھی اُسے لایا ۔ دو منٹ کے بعد مسافروں کی کشمکش میں کچھ کمی ہوئی تو راشد صاحب ایک ڈبے کے اندر جا کر دوسری طرف اتر گئے ۔ کیا دیکھتے ہیں کہ جس جگہ رشاد اس چھوٹے بچے کو پکڑے بیٹھا ہے ۔ وہیں پر کسی مسافر کا سامان اتر رہا ہے ۔ ایک لکھنوی قسم کے بزرگ کھڑے رشاد کو دریافت طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے ۔ پھر اسی طرف ایک برقعہ پوش خاتون اپنے کچھ بچوں کے ساتھ اُتری اُس نے اُترتے ہی کہا " دیکھتے کیا ہو یہ تو رشاد ہے ۔" اور پھر حولدار راشد علی صاحب سمجھ گئے کہ یہ مسافر کون ہیں ۔ وہ لپک کر اپنے بھائی مرشد علی خاں صاحب سے لپٹ گئے اور برقع پوش خاتون نے رشاد کو لپٹا لیا ۔ کچھ ہی سکنڈ گزرے تھے کہ والدہ رشاد بھی آ گئیں اور ان کے پیچھے پیچھے وہ دیہاتی عورت بھی اپنے شوہر کے ساتھ پہنچی ۔ اس نے اپنے لعل کو بخیریت دیکھا تو جھٹ اُٹھا کر سینے سے لگا لیا ۔ اس کے بعد رشاد کے پاؤں چوم چوم کر پکارنے لگی ۔ "ننھے دیوتا جگ جگ جیو ۔ بھگوان ہر دشا میں تمہاری رکشا کرے ۔" اب بجائے اس کے کہ راشد علی خاں صاحب اور ان کی اہلیہ مہمانوں کی اور مہمان میزبانوں کی خیریت پوچھتے ۔

دریافت حال کے لیے اس گنوار عورت سے سوالات کرنے لگے۔ اس نے بتایا کہ اپنے پیروں پر بچے کو بٹھائے ہوئے ٹٹی کرا رہی تھی اچانک گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ سُن کر گھبرا گئی۔ اس گھبراہٹ میں بچہ چھوٹ کر لائن میں جا گرا۔ گاڑی سگنل کے پاس آچکی تھی۔ یہ ننھا دیوتا اسی جگہ پلیٹ فارم پر تھا جھٹ کود پڑا اور اُسے اُس طرف اُٹھا لے گیا۔ بھگوان کی نظر سیدھی تھی نہیں تو دونوں...

گنوار عورت کہتے کہتے رُک گئی۔ اُس نے بچے کو بھینچ لیا اور رشاد کے پیر چومنے کے لیے پھر جھکی۔

"اچھا بس بہت ہو چکا۔ اب تم جاؤ۔ حولدار صاحب نے اس سے کہا اور بھائی صاحب سے پوچھنے لگے۔

"یہ آپ اِس طرف کیوں اُترے؟"

"دیکھ نہیں رہے تھے۔ رش کس قیامت کا تھا۔ سامان اسی طرف تھا۔ سوچا ادھر اتارنے میں آسانی ہوگی، اُتر کر دیکھا تو رشاد میاں کھڑے تھے۔ چھ برس کے بعد دیکھا تو شناخت کرنے لگا۔ مگر بھئی واللہ کیا کارِنمایاں انجام دیا رشاد نے اس عمر میں۔ آخر اس کی رگوں میں خون کس کا ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے کہ اس نے جان بچالی ورنہ حادثہ میں کسر ہی کیا رہ گئی تھی۔ اس نے ہمیں آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا۔" راشد علی صاحب یہ کہہ ہی رہے تھے اتنے میں گاڑی آگے بڑھ کر پھر کھڑی ہوگئی۔ پلیٹ فارم پر ایک بھیڑ رشاد کی اس اندیشہ ناک جُرأت کا انجام دیکھنے کے لیے موجود تھی جیسے ہی گاڑی آگے بڑھی اور رشاد وغیرہ سامنے آئے ہجوم پلیٹ فارم سے کود پڑا۔ سب کو بخیریت دیکھ کر دعاؤں اور تعریفوں سے فضا گونج گئی۔ ہر شخص اس کوشش میں تھا کہ معلوم کرے، یہ ننھا سا لڑکا کون ہے؟ بڑی مشکل سے سب پھر پلیٹ فارم پر آئے۔ کچھ منچلے نوجوانوں نے، جن کے پاس کیمرے تھے۔ رشاد کا فوٹو بھی لے لیا۔ اس کے بعد جب تک راشد علی خاں صاحب اپنے مہمانوں کو لے کر روانہ نہ ہوگئے بھیڑ رشاد کو محبت، حیرت اور دعاؤں کے ساتھ دیکھتی رہی۔ ہر ایک کی زبان پر تھا۔

"بھئی، کمال کر دیا اس ننھے سے لڑکے نے"، ایک طرف سے کسی شعر پسند شخص کی آواز آئی ؎

وہ کام کیا اس نے جو رستم سے نہ ہوگا

تنبیہ

"راشد!"

"جی بھائی جان!"

"میں تم سے مل کر بہت خوش ہوا۔"

"آپ کو خوش ہونا ہی چاہیئے۔ آپ میرے لیے باپ کی جگہ ہیں۔"

"تمہارا اور تمہارے گھر والوں کا رجحان اسلام کی طرف دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی رشاد ماشاءاللہ بڑا نیک بچہ ہے۔ چشم بددور۔ اٹھان خوب ہے۔ تمہارے دوست ضمیر صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں۔ لیکن تمہاری ایک بات پر مجھے سخت اعتراض ہے اعتراض ہی نہیں، اس سے میرے دل کو دھکا سا لگا۔"

"وہ کیا بھائی جان؟"

"سوچو راشد! کیا ہمارے گھر کے کسی فرد سے یہ توقع بھی کی جا سکتی ہے کہ خان بہادر

ارشاد اللہ خاں کی اولاد میں ہوتے ہوئے کوئی ایسا ذلیل پیشہ اختیار کرے گا جس سے بزرگوں کی روح کو صدمہ پہنچے!"

"حاشا و کلا بھائی جان! اللہ کا شکر ہے۔ میں نے کوئی ایسا حرام پیشہ اختیار نہیں کیا جس سے خدا ناخوش ہو۔ اللہ کے دو تین بندے بیوی اور اولاد کی شکل میں جو مجھ سے متعلق ہیں۔ اب سے تین چار سال پہلے کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اب انہیں کوئی لقمہ ایسا نہیں ملتا کہ اس سے حرام خون بن کر خان بہادر مرحوم کے پر پوتوں کی رگوں میں دوڑے۔"

میں بزرگوں کی روحوں کو صدمہ پہنچنے والی بات کہہ رہا تھا تم خدا کی خوشی اور ناخوشی لے بیٹھے۔ عزیزم میرا اشارہ تمہارے اس نئے ذریعہ معاش کی طرف ہے جو تم نے اختیار کیا ہے۔ کیا خان بہادر ارشاد اللہ خاں مرحوم کے پوتے کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ تمہاری طرح دھوبی بن جائے۔ کیا اس سے ہمارے خاندانی وقار پر چوٹ نہیں پڑتی۔ کیا اس سے ہمارا نسلی کردار مجروح نہیں ہوتا۔ اچھے خاصے ملازمت کر رہے تھے۔ ناحق جیلر سے بگاڑ بیٹھے۔ تیسرا سال ہے معطل ہوئے۔ خدا جانے تمہاری معطلی کے کاغذات کس کونے میں جا پڑے کہ ہنوز فیصلہ ہی نہ ہو سکا۔ کیا اچھا تھا جیلر سے میل کر لیتے۔ ایک ڈاکو کی خاطر اچھی بھلی روزی ہاتھ سے نکل گئی۔ چلو، جو ہونا تھا ہوا لیکن ہماری ناک تو تمہیں نہ کٹوانا تھی بھائی میرے!"

"بھائی جان معاف کیجئے گا اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔"

"کہو کہو۔ صاف صاف بتاؤ، تمہیں کیا مجبوری تھی کہ تم دھوبیوں کے پیشے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ شاید اس میں آمدنی زیادہ ہے!"

بھائی جان! آمدنی کے خیال سے میں نے یہ پیشہ اختیار نہیں کیا بلکہ اس کے پیچھے ایک سوچا سمجھا منصوبہ اور نیک مقصد ہے میں اپنے بزرگ بھائی سے جو در اصل مجھ پر باپ کی طرح شفیق ہے درخواست کروں گا کہ اس نیک مقصد مین کامیاب

ہونے کی میرے لیے دعا کرے۔"

"راشد! خدا بہتر جانتا ہے کہ جب تم مجھے یاد آتے ہو تو میں تمہارے لیے دعائے خیر کرتا ہوں۔ تم مجھ کو باپ کا درجہ دے رہے ہو یہ تمہاری سعادت مندی ہے۔ میں بھی اپنی اولاد کی طرح اب بھی تم سے محبت کرتا ہوں جب کہ اب قد و قامت میں تم مجھ سے زیادہ ہو گئے ہو لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ تم نے پیشہ اختیار کر کے اچھا اقدام نہیں کیا۔ معطل ہونے کے بعد تم لکھنؤ چلے آتے بیس کام ایسے میں بتا دیتا جن سے باعزت طور پر روزی مل سکتی تھی میں نے کیسا کیسا لکھا لیکن تم نے ہر بار انکار کیا۔ مرد خدا! آ کر مجھ سے مشورہ بھی نہ کیا۔"

بھائی جان! ضمیر صاحب جن سے آپ مل چکے ہیں اور جن کی اخلاقی قدروں اور علمی لیاقت کی آپ تعریف فرما چکے۔ معطلی کے بعد میں نے ان سے مشورہ کیا۔ میں چاہتا تھا کہ بیوی بچوں کی موجودگی میں کوئی ایسا ذریعہ معاش ہاتھ آ جائے جس سے فوراً اپنی آمدنی اتنی ہو جائے کہ بنیادی ضرورتیں تو پوری ہو جائیں۔ ضمیر صاحب نے کچھ ایسی نشاندہی کی کہ دل نے قبول کر لیا۔ میں نے جو پیشہ اختیار کیا ہے اس کے کرنے میں میرا یہ بھی مقصد ہے کہ اب تک مسلمانوں کے اونچے طبقے کے لوگوں نے بعض ایسے پیشوں کو ذلیل سمجھ رکھا ہے جو در اصل حرام نہیں ہیں بلکہ انبیا اور صلحاء نے انہیں کیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اب جب کہ مسلمانوں کو زندگی بسر کرنے کے لیے راستہ نہیں مل رہا ہے۔ وہ محض اس لیے ان حلال پیشوں سے گریز کرتے ہیں۔ کہ ان کو چھوٹے طبقے کے لوگ کر رہے تھے۔ چنانچہ میرے اس پیشے کے اختیار کرنے کے بعد بہت سے بیکار نوجوانوں نے اس "بت" کو توڑا۔ میں کل ہی آپ سے ملاقات کراؤں گا۔ سید ریحان نے پھلوں کی دکان رکھ لی، خان ظفر نے پانوں کی دکان سنبھالی۔ مرزا سلیمان نے کوئلے کا روزگار شروع کر دیا اور الحمد للہ سب کامیاب جا رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے اس اقدام کا اللہ تعالیٰ مجھے ثواب بھی دے گا۔———

پھر ایک بات اور عرض کروں۔ یہ پیشہ اختیار کرنے سے میرا اور ضمیر صاحب کا مقصد

ایک اور تھا۔ وہ یہ کہ گلی گلی پھر کر میں ہندو مسلم بیوہ خواتین کا سروے کرلوں۔ الحمدللہ وہ میں نے کرلیا ان کو روزگار فراہم کرنے کا منصوبہ بنا کر کام چالو کردیا۔ خدا کے فضل سے کام چل پڑا تھا لیکن ہمارے ایک مہربان بھی پیشے کے طور پر اسے کرنے لگے۔ خیر ہمیں ان کی اس حرکت پر افسوس نہیں کہ وہ بھی بیوہ عورتوں کو کام دے رہے ہیں۔ بلکہ خوشی ہے کہ انہوں نے ہمارا بوجھ بانٹ لیا۔ لیکن انہوں نے بیوہ عورتوں کے مفاد سے زیادہ اپنا مفاد سامنے رکھا۔ وہ زیادہ منافع خود لیتے ہیں اور محنت کار بیواؤں کو کم دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ ناکام جا رہے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ہمیں مخلص سمجھ رہے ہیں خیر اس طرح یہ کام دو جگہ ہونے لگا۔ ایک ہماری نگرانی میں دوسرا ان کے نظم میں۔ ——————

"اللہ کے بندے تم یہی کام کرتے میں لکھنؤ میں اپنے دوستوں سے کہہ تو سکتا کہ کیا میرا بھائی سلائی کی مشینوں کا ایجنٹ ہوگیا ہے۔ اب میں کس منہ سے وہاں تمہارا تعارف کراؤں کیا یہ کہوں کہ تم دھوبی ہوگئے۔"

بھائی جان! اب وہ زمانہ ہے کہ ہمیں اپنے ذہن کی اصلاح کرلینی چاہیئے اللہ اور اللہ کے رسول نے جس پیشے کو ذلیل نہیں کہا ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم اُسے ذلیل سمجھیں جب کہ اس سے ہمیں اچھی خاصی آمدنی بھی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب میرے پاس گھر بیٹھے اتنا کام آنے لگا میری دکان بھری رہتی ہے۔ کل میں آپ کو دکھاؤں گا کہ دو معاون بھی کام کر رہے ہیں۔ ان کو میں دو سو روپیہ ماہانہ تنخواہ دیتا ہوں۔ اب مجھے اللہ کے فضل سے یہ ارمان نہیں کہ میں معطلی سے بحال ہو جاؤں۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہماری سمجھ میں نہیں آتی اور ہم آزمائش کے وقت پریشان ہونے لگتے ہیں لیکن واقعہ یہی ہے کہ اللہ جو کچھ کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔ ظالم انسان اپنے ہی جیسے انسان کے لیے جب روزی کی کھڑکی بند کر دیتا ہے تو اللہ اپنے بندے کے لیے اس سے پہلے پھاٹک کھول چکا ہوتا ہے لیکن لوگ سمجھتے نہیں۔"

راشد صاحب جوش میں اپنا کارنامہ بیان تو کر گئے لیکن بعض کلمات ادا کرنے میں

یہ بھول گئے کہ وہ کس سے باتیں کر رہے ہیں مرشد علی خاں صاحب نے دیکھا کہ چھوٹے بھائی نے اس چھوٹے بھائی نے جسے انہوں نے پالا تھا۔ ان کی بات کی تردید کر دی اور آخر میں یہ سُنا کہ لوگ سمجھتے نہیں، تو اس کا مخاطب خود کو سمجھے۔ وہ چُپ ہو کر رہ گئے۔ ان کے اس طرح خاموش ہو جانے سے حولدار راشد علی خاں کھٹکے بڑے خلوص سے بولے :۔

"بھائی جان! میرا خیال ہے کہ غلطی سے کوئی ایسی بات میں کہہ گیا ہوں جو آپ کو بُری لگی میں قبل اس کے کہ وہ بات معلوم کروں، آپ سے معافی چاہتا ہوں"

"راشد صاحب! اس میں معافی کا سوال ہی کیا ہے۔ ماشاء اللہ اب تم برابر کے ہو گئے۔ پھر سمجھدار بھی۔ مجھ میں اب سمجھ کہاں رہی۔ مجھے تم سے بڑی توقع تھی لیکن تم کو ٹوک کر صدمہ پہنچا۔"

افسوسناک لہجے میں یہ طنز آمیز گفتگو سن کر راشد علی خاں صاحب کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی وہ دم بخود رہ گئے وہ سوچنے لگے کہ انہوں نے کیا کہا تھا اور بھائی صاحب کیا سمجھے۔ وہ اپنے بھائی سے اتنے مرعوب ہو گئے کہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکے۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور پھر وہی آنسو ٹپ ٹپ دامن پر گرنے لگے۔

"راشد! میں نے ایک بات مشورے کے طور پر کہی تھی۔ ماننا نہ ماننا تمہارے اختیار میں تھا۔ پھر جو کچھ تم نے کہا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ سب خلوص کے تحت تھا لیکن بڑھاپے میں میری عادت سی بن گئی ہے کہ میں اپنوں سے اپنی مخالفت نہ سنوں۔ یہاں تک کہ تم سے بھی نہیں لیکن خدا گواہ ہے کہ میں تم سے ناراض نہیں۔ یہ کیا مرد ہو کر عورتوں کی طرح ٹسوے بہانے لگے۔ بھول جاؤ یہ باتیں اور دوسری باتیں کرو۔"

بھائی جان! اللہ کو حاضر و ناظر جان کر عرض کرتا ہوں کہ میں آپ کی حکم عدولی گناہ سمجھتا ہوں لیکن صرف اتنی رعایت چاہتا ہوں کہ آپ کا جو حکم اللہ کے حکم سے ٹکرا جائے اس کی تعمیل سے مجھے معاف رکھیں۔ میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ جس بات کو اللہ اور اللہ کے رسُول

نے جائز فرمایا۔ بندوں کو اسے جائز ہی سمجھنا چاہیئے۔ آپ سمجھے چھوٹا بھائی آپ کی بات کی تردید کر بیٹھا۔ خیر میں بھی چاہتا ہوں کہ یہ موضوع بدلے۔

"راشد اب رات زیادہ ہو گئی ہے۔ اب سو رہو۔ کل باتیں ہوں گی۔ دیکھو سب بچے سو گئے ہیں۔ تمہاری بھابی بھی سو چکی ہیں صرف والدہ رشاد جاگ رہی ہیں۔ مجھے بھی تکان ہے۔"

بڑے بھائی کی اجازت پا کر راشد علی سلام کر کے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

یہ کردار!

"امیّ جان! کیا یہ نماز نہیں پڑھتے؟"

"کون نماز نہیں پڑھتا بیٹے!؟"

"بتادوں؟ آپ ناراض تو نہ ہوں گی!"

"نہیں بیٹا! میں کیوں ناراض ہونے لگی۔ بتاؤ نا؟"

"امیّ جان! کل سے ابو صاحب اور ارشی بھائی آئے ہیں لیکن انہوں نے ایک وقت کی نماز نہیں پڑھی۔ رشو بھی نماز نہیں پڑھتی اور نہ امی صاحبہ ان سے اللہ میاں بہت ناراض ہوں گے!"

مریمؔ، بیٹے کی اس کھلی نکتہ چینی سے گھبرا گئی۔ اُسے یہ فکر ہوگئی کہ کہیں بیٹے پر بڑوں کے عمل کا بُرا اثر نہ پڑے۔ بہت کچھ سوچ کر بولی "بیٹے! بڑوں پر اعتراض نہیں کرتے۔" لیکن اس جواب پر وہ خود مطمئن نہ تھی، بیٹے کو کیا مطمئن کرتی۔

"اچھا امیّ! رشو کی ایک بات بتا دوں!"

"رشو نے کیا کیا؟"

"اس نے دس پیسے کا سکہّ اٹھا لیا تھا!"

"کہاں سے؟"

"باہر سڑک پر پڑا تھا۔"

"تم نے منع کیا تھا۔"

"منع کیا تھا امیّ! میں نے کہا کہ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے گری پڑی چیز اٹھانے سے روکا ہے مگر وہ مانی ہی نہیں۔ اتنے میں ارشی بھائی پہنچ گئے۔ ان کو دکھا کر کہنے لگی "یہ چلے گا۔" ارشی بھائی نے دیکھا۔ بتایا چل جائے گا۔" اس کے بعد دوڑے دوڑے گئے، ریوڑیاں لے آئے۔ مجھے بھی دے رہے تھے۔ میں نے نہیں لیں وہ تو حرام ہوئیں نا امیّ! وہ دونوں کھا گئے، توبہ!" رشاد اپنے گال پر ہاتھ مارنے لگا۔ اور دیکھئے تو امی! رشی بھائی گالیاں بھی بکتے ہیں جھوٹ بھی بولتے ہیں۔"

مریم کی گھبراہٹ میں اور اضافہ ہوا۔ رشاد کہتا رہا۔

"امی جان! یہ سب بہت دیر میں سو کر اُٹھتے ہیں۔ ان کے دیر سے اُٹھنے میں ہمیں ناشتہ بھی دیر میں ملا۔"

بیٹا بات یہ تھی کہ سب کل کے تھکے تھے۔ گاڑی پر کئی گھنٹوں کا سفر پھر اتنی بھیڑ، پھر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آنکھ نہ کھل سکی۔ اور دیکھو بیٹے! یہ سب مہمان ہیں۔ ان سے کوئی ایسی بات نہ کہنا کہ انہیں دُکھ پہنچے۔

"اچھی امی جان اچھا"

یہ کہہ کر رشاد اپنے ہوم ورک کی جگہ پہنچا۔ اس نے اپنی چھوٹی سی میز پر نظر ڈالی تو وہ حیران و پریشان کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ میز پر رکھا ہوا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور اس

کے نیچے رکھا ہوا وہ ٹائم ٹیبل غائب تھا جس کے درمیان خوبصورت گھڑی بنی ہوئی تھی۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ اسی طرح پلٹ پڑا اور ماں کے پاس پہنچ کر رونے لگا۔

"کیا ہوا۔ کیوں رو رہے ہو؟"

"امی جان میرا ٹائم ٹیبل کوئی لے گیا۔"

"بیٹا! کوئی نہیں لے گیا۔ وہ گھر ہی میں ہے۔"

"گھر میں کہاں ہے امی؟"

تمہارے ارشی بھائی نے نکال لیا ہے۔ میں نے دیکھ لیا تھا اس نے اپنے بکس میں لے جا کر رکھا ہے۔"

"تو میں اس کے بکس سے نکال لوں گا۔"

"نہ بیٹے! ایسا نہ کرنا۔ وہ ہمارے مہمان ہیں۔ ان کی چوری کھلے گی تو بہت شرمائیں گے۔ تم دوسرا دیا بنا لینا۔"

رشاد کو اس نصیحت سے اطمینان نہیں ہوا۔ وہ دن بھر اداس رہا۔ اس دن مہمانوں کا دوپہر کا کھانا جمیل صاحب کے یہاں تھا۔ راشد صاحب اپنے بھائی اور دوسرے مہمانوں کو لے کر وہاں جا چکے تھے۔ رشاد دو تین گھنٹوں کی صحبت کے اندر ہی اپنے چچازاد بھائی بہنوں سے دور ہو چکا تھا۔ شام کو گھر پر دعوت کا اہتمام تھا۔ مریم نے اپنی مدد کے لئے اسے روک لیا تھا۔ رشاد بھی اپنے چچازاد بھائی بہنوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتا تھا وہ خوشی سے گھر پر رک گیا۔ ماں کے سمجھانے سے اس نے دل میں یہ تو طے کر لیا کہ کسی سے کہے گا نہیں اور ٹائم ٹیبل دوسرا بنا لے گا لیکن وہ دن بھر نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ عصر کی نماز پڑھ کر اس نے ماں سے ایسی بات کہی کہ مریم جیسی سنجیدہ ماں دنگ رہ گئی۔ رشاد نے پوچھا "امی جان یہ سب لکھنؤ کب جائیں گے۔"

مریم نے سر پیٹ لیا۔ "اف ایک ہی دن میں میزبانوں نے رشاد کو بیزار کر دیا۔"

اس نے سمجھانا شروع کیا۔

"بیٹا! بری بات! ایسی بات نہیں پوچھتے۔ مہمانوں کی ہر طرح خاطر مدارات کرتے ہیں۔ اگر وہ بے پوچھے بھی کوئی چیز لے لیں تو برا نہ ماننا چاہیے۔ ان کی خدمت کرنا چاہیئے۔ تم کو یاد نہیں! پیارے رسولؐ کے گھر ایک شخص مہمان ہوا تھا لیکن رات کو اس نے بستر گندہ کر دیا اور صبح ہونے سے پہلے ہی بھاگ گیا۔ پیارے رسولؐ نے وہ ناپاک بستر خود دھویا تھا"

مریم یہ نصیحت کرنے کو کر تو رہی تھی لیکن یہ اس کے دل کی آواز نہیں تھی اسے اندیشہ تھا کہ ان غیر تربیت یافتہ بچوں کے کردار سے رشاد خود متاثر نہ ہو جائے۔ اسی لئے وہ اس طرح کھل کر رشاد کو نہ سمجھا سکی جس طرح ہمیشہ اسے مطمئن کر دیا کرتی تھی۔ اس نے مشورے کے طور پر یہ ساری الجھن رضیہ کی ماں کے سامنے رکھی۔ ملانی بی بھی سوچ میں پڑ گئیں۔ انہیں حیرت یہ تھی کہ رشاد کے اچھے اطوار کا اثر مہمان بچوں نے قبول نہیں کیا۔ آخر کار انھوں نے یہی رائے دی کہ جب تک مہمان یہاں رہیں ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جاتا رہے ہماری طرف سے کوئی بات ایسی سرزد نہ ہو کہ انھیں بے توجہی کی شکایت کا موقع ملے۔ انھوں نے رضیہ اور رشاد کو بھی سمجھایا اور مریم کو بھی یہی رائے دی۔

مریم شام کی دعوت کا اہتمام رضیہ کی والدہ کے مشورے سے کر رہی تھی۔ اس نے جان مار کر مغرب کے وقت کھانا تیار کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس انتظار میں بیٹھی کہ مہمان آئیں تو ان کے سامنے پیش کیا جائے۔ مغرب کے وقت کیا دیکھتی ہے کہ حولدار صاحب تنہا چلے آ رہے ہیں۔ مریم کی زبان

سے نکلائیے اور بھائی صاحب وغیرہ"

"وہ سب سینما تشریف لے گئے ہیں۔ دس بجے تک آئیں گے"، دو معصوم بچوں (ارشاد اور رضیہ) کے سامنے اور دو بھولی بھالی عورتوں کے روبرو انھیں یہ کہتے اچھا نہیں لگا مگر کرتے کیا اطلاع دینی ہی تھی۔

تریا چر تر

"کہو بھئی، ضمیر صاحب کے یہاں کی دعوت پسند آئی؟"

دعوت تو جیسی تھی، تھی، انداز تو وہی راشد کے گھر کا سا تھا۔ کھانوں میں بس جزوی ہی فرق تھا۔ مگر ملّانی بی کا سگھڑپن، ان کی سادگی اور نفاست میں سلیقہ کچھ ایسا تھا کہ مریم کو ان کی شاگرد سمجھو۔"

"سچی بات یہی ہے جس طرح ملّانی بی کا اثر مریم پر پڑا ہے اسی طرح ضمیر صاحب سے راشد متاثر ہے۔ ضمیر صاحب کی صحبت میں رہ کر راشد میں انسانیت آتی جا رہی ہے۔ ہمارے مذاق اور وقار سے گری ہوئی کچھ باتیں بھی پیدا ہو گئی ہیں مگر یہ انقلاب زمانہ ہے۔ اب تو وہ زمانہ آ رہا ہے کہ اونچے سے اونچے طبقے کے لوگوں کو وہ سارے پیشے کرنا پڑیں گے جو دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ ہمارے راشد صاحب ہی کو دیکھئے۔ دھوبی بن گئے۔ لاحول ولا قوۃ۔"

اونھ! تم میں یہ عیب ہے، بات میں بات نکال کر طول دے دیتے ہو۔ میں کیا بتا رہی تھی اور تم اپنی لے نے بیٹھے۔"

"اچھا تم اپنی کہو۔"

میں کہہ رہی تھی کہ ملّانی بی گھر چلانے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں ساتھ ہی اپنی بیٹی کو اس عمر میں اتنا کچھ سکھا دیا ہے کہ دوسرا کیا کر سکتا ہے۔ مگر میں تو یہ کہتی ہوں کہ سکھلانے والا لاکھوں کا استاد ہو اگر سیکھنے والا دھیان نہ دے تو کچھ نہیں کر سکتا۔ رضیہ ہے تو دس بارہ سال کی بچّی ہی مگر اس نے ماں سے پائی ہوئی تعلیم اور اس سے سیکھے ہوئے ہنر کو ایسا دماغ میں بٹھایا ہے کہ واہ ہی واہ! یہ عمر دیکھئے، ابھی پردہ نام کو ہے۔ تم نے تو دیکھا ہی ہوگا۔ ہر طرح کا کھانا وہ پکا لیتی ہے۔ ہر طرح کا کپڑا وہ سی لیتی ہے کشیدہ کاری میں اپنے سے ڈیوڑھی عمروں کی لڑکیوں کے کان کاٹتی ہے۔ میں تو دنگ رہ گئی دیکھ کر اس نے "قل ہو اللہ" پوری سورہ ایسی صفائی سے کاڑھی ہے کہ کیا کوئی کاڑھے گا۔ پھر بات چیت میں اٹھنے بیٹھنے میں طور طریقوں میں۔ گن ڈھنگ میں، پڑھنے لکھنے میں۔ ادب و سلیقے میں میرا مطلب یہ کہ جس رخ سے دیکھو چشم بد دور زبان سے نکلتا ہے۔ یہ عمر ہے اور ہر کام ایسا کرتی ہے کہ "معوذتین" پڑھ کر پھونکو۔"

ارشی کی ماں! ذرا ایک بات کا جواب تو دینا! ابھی تم نے میرے متعلق کہا تھا کہ بات میں بات نکال کر طول دینا میری عادت ہے اور یہ جو تم فرما رہی ہو کیا ہے۔ زبان ہے کہ قینچی کی طرح چلی جا رہی ہے۔ رکتی ہی نہیں۔ پھر تمہاری یہ عادت کہ جس میں ذرا سا گن دیکھ لیا۔ بس اُس کی تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔ آخر ہم سے مطلب؟"

مطلب ہی ہے ارشی کے ابّا! میں کہتی ہوں، راشد تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔ بھائی ہی نہیں بلکہ مثل اولاد۔ وہ تمہارا ممنون احسان بھی ہے۔ تمہارا ادب

واحترام بھی کرتا ہے۔ تمہارے خلاف کوئی بات نہیں کر سکتا۔

تم تو بیزار کیے دیتی ہو۔ کہاں ضمیر صاحب کے گھر بھر کی تعریف ہو رہی تھی کہاں اب میرے بھائی کی طرف مڑ گئیں۔ میں کہتا ہوں نہایت بے وقوف ہے راشد۔ خیر چھوڑو اس کی بات تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

میرا مطلب یہ ہے کہ راشد اور ضمیر صاحب میں جو میل جول ہے وہ بھی تم سے چھپ نہ سکا ہوگا۔ دونوں ایک دوسرے کے کیسے ہمدرد اور بہی خواہ ہیں۔ ہر بات میں دونوں کی رائے ایک، دونوں کا خیال ایک، دونوں کا مزاج ایک، دونوں کا انداز ایک . . . ."

"اور ایک کے آگے تمہارا سر۔ اتنا کچھ کہہ گئیں لیکن ہنوز دلّی دور است میں کہتا ہوں کہ تم واقعی کہنا کیا چاہتی ہو؟"

اچھا، یہ "تمہارا سر" عورتوں والی بولی کب سے سیکھ لی۔ مردوں میں زبان سے نکالو گے تو لکھنؤ کا نام خوب اونچا کرو گے۔"

"لو۔ بات پھر بھی سامنے نہیں آئی اور لفظی گرفت ہونے لگی۔"

ارشی کے ابّا! تم جانتے ہو کہ مرد تو بس کمانے کے ہوتے ہیں اور گھر چلانا عورتوں کا کام ہے . . ."

"اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد گھر کے نظم میں بے وقوف محض ہے اور چاہے دوسرا کوئی مرد بے وقوف ہو یا نہ ہو، کم از کم میں تمہاری نظر میں ایسا ہی ہوں۔"

عجیب وہمی آدمی ہو۔ بات نہیں سنتے، کہنے خود نہیں دیتے۔ میں کہتی ہوں کہ راشد سے ارشی اور رضیہ کے رشتے کے لیے کیوں نہ کہو۔"

"اللہ اکبر! یہ پک رہا ہے تمہارے دماغ میں۔ تم نے ایک ہی رُخ دیکھا، ذرا اپنی طرف بھی تو دیکھو۔"

تو میں کیا بُری ہوں۔ اللہ کا دیا میرے گھر میں کیا نہیں ہے۔ ارشی کی عمر کیا ہے یہی چودہ پندرہ برس۔ اور دسویں کلاس سے نکل گیا ہے۔ شکل وصورت میں رضیہ سے کم نہیں۔ ذرا ہمارے گھر دینداری میں کمی ہے۔ تو وہ جب چاہو اختیار کر لو۔ میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی لیکن ملّانی بی کے یہاں عصر میں ضرور کھڑی ہوئی۔

ہی ہی ہی ہی۔ تو تمہاری یہ نماز بھی شاید اسی لیے تھی کہ ملّانی بی تم کو دیندار سمجھیں اور خود تمہارا مطلب اس سے یہ کہ رضیہ تم کو مل جائے لیکن ان دنوں میں راشد اور ضمیر صاحب سے گفتگو کر کے میں ان کے دین کا جہاں تک مطلب سمجھا ہوں۔ یہ ہے کہ گھر سے بازار تک اور بازار سے میدان کارزار تک جتنے بھی کام کرنا ہوں وہ سب قرآن وسنت کے مطابق ہوں۔ ضمیر صاحب نے "اُدخلوا فی السلم کافہ" پر گفتگو کر کے یہی مفہوم بیان کیا تھا اور ہمارے راشد صاحب اسی مفہوم پر جھوم رہے تھے۔ مطلب مجھ پر تبلیغ کرتا تھا مگر: ؎

کوہساروں پر نشانِ نقشِ پا ملتا نہیں

میری یہ عمر ہو گئی۔ باپ دادا سے جو دین ملا بس اسی پر عمل کر سکوں تو بہت ہے۔ ضمیر صاحب کے بزرگوں کی شاگردی کرنا ہوتی تو راشد کی طرح میں بھی انسپکٹری سے ریٹائر ہونے کے بجائے برخاست ہو گیا ہوتا، پھر میں یہ جائیداد کیسے بنا پاتا کہ پنشن ہونے کے بعد تم گلچھرے اُڑا رہی ہو۔ راشد کی طرح مجھ سے کوئی کام کاہے کو ہوتا۔

"تو میں تمہاری کمائی لٹائے دے رہی ہوں نا! کہہ لو جو کہنا ہے مگر تم بتاؤ کہ ارشی کے لیے رشتہ مانگ رہے ہو یا نہیں؟"

ارے ابھی جلدی کیا ہے۔ ہزاروں لڑکیاں ایک سے ایک مل جائیں گی۔ آج کل لڑکیوں کو پوچھتا کون ہے۔ ارشی کی بات جہاں ڈالوں گا، منہ سے نکلتے

ہی اقرار ہوگا۔ کیا ضمیر صاحب ہی کی ایک لڑکی ہے ؟"

ہاں، میں کہتی ہوں۔ میں نے ہزاروں لڑکیاں دیکھی ہیں مگر جو بات رضیہ میں ہے، وہ کہیں نظر نہ آئی اور اگر تمہارا مطلب یہ ہے کہ دوسری جگہ جہیز زیادہ ملے گا تو میں یہ بھی بتا دوں۔ ضمیر صاحب کھاتے پیتے آدمی ہیں اور ان کی صرف یہی ایک لڑکی ہے۔ سمجھے تم میرا مطلب !"

"مان گیا میں تمہاری چالاکی کو۔"

یہ چالاکی نہیں ارشی کے ابّا! تم دیکھ رہے ہو آج کل جہاں کہیں کسی لونڈے کی شادی ہوگئی بس اس نے ماں باپ کو جوتی کی نوک پر مار دیا۔ کیوں؟ بس بیوی کی لگائی بجھائی، سے لیکن رضیہ ایسی ثابت نہ ہوگی۔ ایک طرف تو وہ، وہ کچھ پڑھ لکھ رہی ہے جو پڑھنا چاہیئے۔ ضمیر صاحب نے گھر پر ہی ٹیوٹر مقرر کر دیئے ہیں۔ ماں خود پڑھاتی ہے۔ عربی اور اردو ضمیر صاحب کے ذمہ ہے۔ خطرناک تو وہی لونڈیاں ہوتی ہیں جو کالج میں تربیت پا کر نکلتی ہیں۔

"تم بات تو ٹھیک کہتی ہو۔ تمہاری دلیل اٹوٹ ہے لیکن مجھے رشتہ ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے۔"

"کیوں ؟"

"میرا خیال ہے کہ شاید راشد اپنے رشاد کے لیے وہی کچھ سوچ رہا ہوگا جو تم اپنے ارشی کے لیے سوچ رہی ہو۔"

پھر تو اور جلدی کرنا چاہیئے۔ تم راشد سے ارشی کے بارے میں پہل کر لو۔ تم بات ڈال دو گے تو پھر راشد ہمت نہ کر سکے گا۔"

میرا یہ بھی خیال ہے کہ ضمیر صاحب کی نظروں میں رشاد ابھی سے کھُب گیا ہے۔ غالباً وہ اپنی پیاری بیٹی رضیہ کے بارے میں راشد سے خود کہیں گے۔ یہ

یں نے یوں اندازہ لگایا کہ ضمیر صاحب بات بات میں رشاد کی تعریف کرتے ہیں۔ فرمارہے تھے کہ رشاد کہیں کھیلنے نہیں جاتا۔ کھیلتا ہے تو محض رضیہ کے ساتھ بس اس سے تم بھی اندازہ لگاسکتی ہو کہ ہوا کا رُخ کدھر ہے۔"

پھر تو ضروری ہوگیا کہ تم اپنے اس اثر اور دباؤ سے کام لو، جو راشد پر تمہارا ہے۔ جب راشد ہی کی زبان بند کردو گے تو ضمیر صاحب کیا کرسکیں گے۔"

میں سوچ سمجھ کر اس معاملے میں ہاتھ ڈالوں گا۔ جلدی کا کام شیطان کا۔ جلدی میں کام بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ بہر حال پسند مجھے بھی ہے اگر یہ رشتہ ہو جائے۔

"لکھنؤ چلنے سے پیشتر تم ذکر ضرور کردو۔"

لیکن اب یہ کرو کہ جب تک یہاں رہو۔ نماز سے غافل نہ ہو۔ میں بھی کل سے شروع کردوں گا۔ تم بھی پڑھو اور ارشی کو سمجھادو اُس میں کچھ ایسی باتیں ہیں جو شاید یہاں لوگ پسند نہ کرتے ہوں۔"

ہاں اس نے ایک بات تو ایسی کی کہ رشاد اس کے پاس نہیں پھٹکتا۔

"کیا؟"

"اس نے رشاد کا ٹائم ٹیبل چرالیا۔"

"تم کو کیسے معلوم ہوا؟"

میں اس کا بکس دیکھ بھال رہی تھی اسی میں نیچے رکھا تھا۔ میں نے پوچھا تو چھوٹے نے بتایا کہ رشاد نے خود دیا ہے۔ میں نے شکریہ ادا کرنے کے طور پر مریم کے سامنے رشاد کی تعریف کی تو معلوم ہوا کہ معاملہ اُلٹا ہے۔"

"یہ تو بڑا غضب ہوا۔ صاحبزادے کے یہی کرتوت ہیں تو ابھی سے اپنی پتنگ کٹی سمجھو، سمجھیں تم!"

"میں سب سمجھ رہی ہوں لیکن کل سے تم دیکھنا۔ ارشی بدلا ہوا نظر آئے گا۔"

عورت ذات چیز ہی ایسی ہے۔ اس کے نام پر مرد سب کچھ اختیار کر لیتا ہے۔ فرہاد نے عورت کے کہنے سے پہاڑ کاٹ ڈالا تھا۔ قیس نے عورت کے کارن کیا کچھ نہ کیا اگر ہمارے فرزند ارجمند کو، گو وہ ہنوز نابالغ سہی لیکن اشارہ تک مل گیا، تو دیکھنا رضیہ کو پانے کے لیے حضرت وہ پاؤں نکالیں گے کہ دیکھنے والے دیکھیں گے اور حیرت سے کہیں گے کہ ماشاء اللہ اس عمر میں کیسا نمازی بچہ ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ اس کی نماز کس کے لیے ہے۔"

اللہ نے چاہا تو اب تک یہاں وہ جو غلطیاں کر چکا ہے اس کا ازالہ ہو جائے گا۔ اور دیکھو۔ کل سے سنیما کا نام یہاں مت لینا۔ یہ شوق لکھنؤ ہی میں پورا کرنا۔ سمجھ گئے نا!"

"سب سمجھتا ہوں۔ خدا تریا چرتر سے بچائے۔"

تریا چرتر کا چبھتا ہوا لفظ سن کر بیوی بھنّا کر کچھ کہنا ہی چاہتی تھیں کہ شوہر نے دوسری طرف کروٹ لے لی اور وہ کسی مصلحت کی وجہ سے چپ کی چپ ہی رہیں۔ پھر نہ جانے اپنی اپنی جگہ میاں بیوی کیا سوچتے رہے اور خدا جانے کب انہیں نیند آئی۔

رواداری

"دیکھئے تو ضمیر صاحب! یہ "حضرت" کیا فرما رہے ہیں۔" راشد صاحب نے جاتے ہی تشویشناک لب و لہجے میں کہا اور متفکر ہو کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ رشاد ان کے ساتھ تھا۔ وہ بھی ایک طرف ادب سے بیٹھ گیا۔ ضمیر صاحب نے رشاد کی طرف دیکھا۔ پوچھا کیا کہتے ہو بیٹے؟ اس نے کہا۔ چچا میاں! آپ نے مجھے قرآن مجید کا ترجمہ کراتے ہوئے پڑھایا ہے کہ اللہ نے سچا دین صرف اسلام ہی کو بتایا ہے۔"

ٹھیک تو بتایا میں نے "ان الدین عند اللہ الاسلام"!

وہ تو بالکل ٹھیک ہے چچا میاں! لیکن آج ایک ماسٹر صاحب نے اسکول میں کہا کہ اچھی باتیں سارے مذہبوں میں ہیں اور سارے ہی مذہب سچے ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے ایسی بات کہی ہے جس سے میرے دل پر چوٹ پڑی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔"

"کیا کہا انہوں نے؟"

انہوں نے کہا کہ خدا تو سب کا ہے لیکن ایک مذہب کے لوگ ہیں کہ اپنے ہی دین کو سچا مانتے ہیں اور جتنے دین دھرم ہیں ان کو غلط اور جھوٹا کہتے ہیں۔ کتنے چھوٹے دل کے ہیں یہ لوگ۔ ان میں رواداری نام کو نہیں اور یہی رواداری نہ ہونے سے آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ چچا میاں! دیکھئے تو ماسٹر صاحب نے "ایک مذہب" کہہ کر ہمارے دین اسلام پر ہی تو چوٹ کی ہے نا؟ اور اس کے ماننے والے مسلمانوں کو چھوٹے دل کا بتایا۔ اور بتایا کہ ان میں رواداری نہیں ہوتی۔ تو یہ سُن کر مجھے بڑی تکلیف پہنچی۔ مجھے یہ سنتے ہی یہ آیت یاد آگئی جو آپ نے ابھی پڑھی لیکن میں نے اس ڈر سے کچھ نہ کہا کہ کہیں ماسٹر صاحب اسی آیت کو نہ جھٹلا دیں تو خواہ مخواہ ایک جھگڑا اٹھ کھڑا ہو۔"

ضمیر صاحب نے رشاد کو کہنے دیا۔ جب وہ اپنی بات پوری کر چکا تو انہوں نے کہا کہ جاؤ رضیہ کو بھی اسی کمرے میں بلا لاؤ۔ وہ بھی اس سوال کا جواب سُنے۔ دوبارہ اُسے بتانا نہ پڑے۔

رشاد اٹھ کر اندر گیا۔ راشد صاحب نے اتنی دیر میں اپنا وہ اندیشہ ضمیر صاحب کے سامنے رکھا جس کی وجہ سے وہ اسکولوں میں تعلیم دلانے کے خلاف تھے انہوں نے کہا۔

"ضمیر صاحب! جب ان اسکولوں کے ماسٹر کھلّم کھلاّ اسلام پر چوٹ کریں اور معصوم بچوں کو اسلام سے بدظن کرنے کی کوشش کریں تو ہمیں ان اسکولوں سے اپنے بچوّں کو بچانا چاہیئے، لیکن آپ کے مشورے چونکہ بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ اس لیے میں نے اسے وہاں داخل کر دیا۔ اب دیکھئے وہی سامنے آیا جس کا خطرہ تھا۔"

آپ گھبرائیں نہیں حوالدار صاحب! ابھی رشاد مطمئن ہو جائے گا۔

ایک رشاد کو مطمئن کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ اور بہت سے مسلمان بچے جو ان اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان سب کے گھروں میں اتنے ضمیر صاحب کہاں

ہوں گے۔ میں کہتا ہوں ضمیر صاحب تو ایک ہی صاحب ہیں وہ بس رشاد میاں کو مطمئن کر لیں اور باقی یہ مسلمان نہ بچے؟"

ضمیر صاحب اس کے جواب میں کچھ کہنے والے تھے کہ رشاد اور رضیہ دونوں آگئے اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ ضمیر صاحب نے رشاد سے کہا کہ وہ اپنی الجھن پھر بیان کرے۔ رشاد نے رضیہ کے سامنے پھر کہا۔ اس کے بعد ضمیر صاحب نے سمجھانا شروع کیا۔

اس میں شک نہیں کہ ہر مذہب میں کچھ نہ کچھ اچھی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اور ہر مذہب انسانیت کو سنوارنے کے اصول و قواعد دیتا ہے لیکن ہر مذہب کے اصول و قواعد کی بنیاد کچھ عقائد ہوتے ہیں۔ کسی مذہب کے یہی عقائد جو شخص مان لیتا ہے۔ وہ اس مذہب کا ماننے والا کہلاتا ہے۔ اب دیکھو، غور سے سنو، ایک مذہب کہتا ہے کہ خدا ایک نہیں تین ہیں۔ دوسرا مذہب یہ عقیدہ دیتا ہے کہ خدا دو ہیں۔ ایک نیکی کا خدا دوسرا بدی کا۔ ایک اور مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ خدا بہت سے ہیں۔ ان خداؤں کے کام بھی الگ الگ ہیں۔ ایک خدا پیدا کرنے والا ہے ایک خدا روزی دینے والا ہے۔ ایک خدا مارنے والا ہے۔ ایک خدا پانی کا ہے۔ ایک ہوا کا۔ اس طرح نہ جانے کتنے خداؤں کا عقیدہ دنیا کے بعض مذہبوں میں پایا جاتا ہے۔ اور ایک مذہب یہ کہتا ہے کہ نہیں خدا صرف ایک ہی ہے۔ وہی ہمارا خالق ہے۔ وہی رازق ہے، وہی حاکم اور مالک ہے۔ اسی کے ہاتھ میں دنیا جہان کا نظم ہے۔ اس کا کوئی ساجھی نہیں۔ سب کچھ اسی کے بس میں ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ مخلوق ہے اور اس ایک خدا کے سوا کسی اور کے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔ وہ ایک خدا کسی کا محتاج نہیں بلکہ سب اس کے محتاج ہیں۔ سن رہے ہو رشاد میاں!

"جی!"

اچھا تو اب یہ بتاؤ کہ یہ ساری باتیں جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں

سب ٹھیک کہی جاسکتی ہیں؟ یعنی خدا ایک ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ خدا دو ہیں۔ یہ بھی ٹھیک۔ خدا تین ہیں، یہ بھی ٹھیک۔ اور خدا بہت سے ہیں، یہ بھی ٹھیک اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ خدا ہے ہی نہیں۔ جیسا کہ آج کل بہت سے سر پھرے کہتے ہیں۔ بتائیے رشاد میاں! یہ ساری مختلف باتیں ٹھیک کیسے ہوسکتی ہیں ان میں سے ایک ہی بات ٹھیک ہوسکتی ہے۔ جو شخص اس بات کو صحیح مانتا ہے کہ خدا دو تین ہیں، وہ اگر یہ کہے کہ خدا ایک بھی ہے تو کیا اُسے لوگ جھوٹا نہ کہیں گے۔"

ہاں، اُسے جھوٹا سمجھا جائے گا۔"

"رضیہ بیٹی! تم سمجھ رہی ہو!"

"جی ہاں ابّا جان! بات تو ان میں سے ایک ہی سچی ہے اور سچی وہ ہے جو ہمارا اسلام کہتا ہے کہ خدا ایک ہے۔"

خیر ابھی میں اس پر نہیں آتا۔ ابھی تو یہ اطمینان کر لینا چاہیئے کہ یہ بات غلط ہے کہ سارے مذہب سچے ہیں۔ سچا صرف ایک ہی مذہب ہوسکتا ہے اب جس کا دل جس مذہب کے عقیدوں پر مطمئن ہو وہ اُسے سچّا مان لے۔ پھر وہ دوسروں کے مذہب کو بھی سچا کہے گا تو یا تو وہ یہ بات کسی خاص مکاری کی وجہ سے کہے گا یا پھر وہ عقل سے کورا ہی ہوگا۔

چچا میاں: میں بالکل سمجھ گیا۔ میں اپنے مذہب پر بالکل مطمئن ہوں۔ خدا تو بس ایک ہی ہے۔ یہ بات اتنی سچی ہے کہ جو لوگ بہت سے خداؤں کو مانتے ہیں۔ وہ بھی ایک بڑے خدا کے قائل ہیں۔ آپ جب مجھے فارسی پڑھاتے تھے تو اس میں خدائے خدائگاں کا لفظ آتا تھا۔ اسی طرح اسکولوں میں جو کتابیں میں پڑھتا ہوں، ان میں بھی ایک مہادیو کا تصور ہے۔ آپ سچ فرماتے ہیں۔ سچی بات ایک ہی ہے اور قرآن سچ کہتا ہے کہ "ان الدین عند اللہ الاسلام" اللہ کے نزدیک اسلام ہی سچا دین ہے۔ واقعی،

توحید حق ہے اور شرک باطل ہے۔ جس طرح توحید کے ساتھ شرک کا جوڑ نہیں ملتا۔ اسی طرح اسلام کے ساتھ دوسرے مذہبوں کا جوڑ نہیں مل سکتا۔ ہے نا چچا میاں یہ بات؟"

"اب تم سمجھ گئے! اب لفظ "رواداری" کے معنی بھی سمجھ لو تاکہ تم کو کہیں دھوکہ نہ ہو۔ دیکھو رواداری کے معنی ہیں، دوسروں کا خیر خواہ ہونا۔ لوگوں سے ایسی باتیں کرنا کہ ان کا دل انہیں قبول کرلے۔ دوسروں سے اس طرح ملنا کہ وہ اپنا ساتھی سمجھیں۔ زبردستی اپنی بات منوانا رواداری نہیں ہے اور نہ یہی رواداری ہے کہ ایک جھوٹ بات کو سچ مان لیا جائے۔ کسی وجہ سے جھوٹ بات کو سچ مان لینا یا زبان سے کہہ دینا کہ بھئی تم بھی سچے اور تمہارا مخالف بھی سچا تو یہ تو کھلی ہوئی مکاری ہے یا پھر لوگوں کو بے وقوف بنانا ہے۔

دیکھو میاں رشاد! رواداری یہ ہے کہ اگر کوئی تم پر کڑی تنقید کرے چاہے وہ تم کو ذلیل کرنے کے لیے ہی کرے لیکن تم ٹھنڈے دل سے برداشت کر لو اور پھر جواب دو تو ایسا کہ سننے والا سمجھے، تم کو اس کی بات بُری نہیں لگی۔ میں نے تم کو قرآن مجید کے ترجمے میں پڑھایا ہے۔ "لا اکراہ فی الدین" دین میں زبردستی نہیں، کیا سمجھے تم؟ قرآن کہتا ہے کہ زبردستی کسی کو مسلمان کرنے کی کوشش نہ کرو۔ نہ ڈرا کر نہ لالچ دے کر بلکہ اسلام کے بنیادی عقیدے پیش کرو، لوگوں کو سمجھاؤ نرمی کے ساتھ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ نے نبی بنایا تو حکم دیا کہ جا کر فرعون کو سمجھاؤ، اُس نے بہت سر اٹھایا ہے لیکن نرمی کے ساتھ سمجھانا، کوئی ایسی بات مُنہ سے نہ نکالنا کہ سننے والوں کو دُکھ پہنچے دیکھنا رشاد میاں اسے کہتے ہیں رواداری جب اسلام زبردستی مسلمان بنانے کو منع کرتا ہے تو اور اس سے بڑھ کر کیا بات ہو سکتی ہے کہ ایک مسلمان رواداری کے تحت کرے گا۔ اور جو مسلمان ایسا نہ کرے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے نہ کہ اسلام!

"بالکل ٹھیک چچا میاں!"

اب سنو رشاد میاں! ایک مزے کی بات۔ حولدار صاحب آپ بھی دلچسپی لیں

شاید۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سارے مذاہب سچے ہیں تو ذرا ان سے کہیے کہ بھئی جب یہ بات ہے تو کچھ دن ہندو رہیے، کچھ دن عیسائی کچھ دن پارسی کچھ دن یہودی اور کچھ دن کے لیے مسلمان بن جائیے تو دیکھیے یہ منظور نہ کریں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس طرح کی باتیں کرنے والے کا دل خود اس کا گواہ نہیں ہوتا تم نے سنا ہوگا کہ بعض لوگوں نے جو واقعی اچھے لوگ کہے جا سکتے ہیں لیکن یہی بات ان کے دل میں بیٹھ گئی کہ سب مذہب سچے ہیں۔ تو انہوں نے کچھ باتیں ایک مذہب سے لیں کچھ دوسرے مذہب سے اور کچھ دیگر مذہبوں سے چوں چوں کا مربہ پیش کر کے لوگوں کو تلقین کی کہ اب یہ مانو۔ سوچو تو ان بے چاروں نے کتنی بڑی "رواداری" کا کارنامہ انجام دیا لیکن کس نے مانی ان کی بات؟ ہندوستان کے مشہور بادشاہ اکبر کو بہکا کر ایسا ہی "دینِ الٰہی اکبر شاہی" رائج کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس کی کامیابی معلوم! کبیر داس جیسے بزرگوں نے بھی عمر بھر اسی طرح کی رواداری کا پیغام سنایا لیکن حق اپنی جگہ حق رہا اور باطل باطل۔ باطل کتنے ہی خوبصورت لبادے میں آئے لیکن حق کا سامنا ہونے پر اپنا لبادہ اتار پھینکتا ہے۔ سمجھ گئے تم رشاد میاں؟"

"چچا میاں سمجھ گیا میں!"

"دیکھو، اسکول میں تمہارے سامنے طرح طرح کی باتیں آئیں گی۔ بہت سی باتیں پڑھانے والے سوچ سمجھ کر خواہ مخواہ اسلام کو سبک کرنے کی طرف مڑ جائیں گے تو تم رواداری سے کام لینا۔ اگر غلط بات سامنے آئے اور تم خوبصورت انداز میں اسے رد کر سکو تو ٹھیک ہے ورنہ چپ رہنا اور مجھ سے مشورہ کر لینا۔"

"بہت اچھا چچا میاں!"

اس بات چیت کے بعد ضمیر صاحب نے رشاد اور رضیہ سے کہا کہ جا کر کھیلیں۔ ان کے جانے کے بعد حولدار صاحب سے کہا "دیکھیے! رشاد کے متعلق میرا وہ خیال کتنا صحیح نکلا کہ اس میں حق کے قبول کر لینے کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے، باطل اُسے کھٹک جاتا

ہے اور جب تک حق بات کی تلاش نہیں کر لیتا بے چین رہتا ہے۔ میں نے اسی لیے آپ کو رائے دی کہ آپ اُسے وہاں تعلیم دلائیں۔ اس طرح اس کے سامنے سارے منفی پہلو آجائیں گے اور وہ آگے چل کر ان شاء اللہ بڑے شرح صدر کے ساتھ اسلامی اصول و نظریات لوگوں کے سامنے پیش کر سکے گا۔ آپ اس سے پوچھتے ضرور رہا کیجیے کہ کبھی کیا پڑھایا جاتا ہے؟ اور پھر کبھی کبھی اس کے نصاب کی کتابیں پڑھوا کر سنئیے بھی میں نے سُنا ہے کہ اسکولی کتابوں میں بڑی خرافات داخل کر دی گئی ہیں۔ ہمارے لڑکپن میں ایسی کتابیں نہیں تھیں۔ ہندو مسلمان سکھ وغیرہ سب ہی ان کتابوں کو پڑھتے تھے اور کسی کا دل ان سے نہیں دکھتا تھا بلکہ اخلاق سنورتا تھا! کاش کہ محکمہ تعلیم پھر وہی تعلیم رائج کرتا۔"

"ضمیر صاحب! میرے دل میں بڑے بڑے اندیشے ابھرتے رہتے ہیں۔ اس وقت آپ نے بڑے آسان لفظوں میں بات سمجھادی۔ اور یہ آپ ہی کا کام ہے۔ کاش! کوئی ایسی صورت نکل آتی کہ وہ تمام بچے جو ان اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ بھی اسی طرح کی باتیں سنتے۔"

سوچ تو میں بھی رہا ہوں۔ ایک صورت ہے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے ہم ایک نائٹ اسکول قائم کریں اور یہ اعلان کریں کہ اس میں اسکولی لڑکوں کو مفت ہی پڑھایا جائے گا۔ امید ہے کہ بہت سے لڑکے آئیں گے۔ ہم اس میں مسلم و غیر مسلم کی تفریق نہ کریں۔ جو آئے اُسے آنے دیں اور فی الحال کسی ایسے مسلمان ماسٹر کا انتظام کریں جو اچھی ہندی جانتا ہو اور اسلام سے بھی واقف ہو۔ یہ ماسٹر چھانٹ چھانٹ کر وہی اسباق بطور ٹیوشن پڑھائے جن میں غلط نظریات پیش کیے گئے ہوں وہ انہیں اسلامی روشنی میں اس رواداری کے ساتھ پیش کرے کہ غیر مسلم لڑکے بھی غلط کو غلط کہنے پر مجبور ہو جائیں کم سے کم ان کا دل تو مان ہی لے۔" "لیکن ایسا ماسٹر کہاں سے آئے؟"

بہرحال میں ایسے ماسٹر کی تلاش میں ہوں مل گیا تو میں اپنے ہی گھر کے کسی کمرے میں نائٹ اسکول قائم کردوں گا۔"

"اور اس ٹیوٹر کی تنخواہ؟"

پہلے ایسا شخص ملے تو۔ اس کا بھی کچھ انتظام اللہ تعالیٰ کرادے گا۔ کیا معلوم کوئی شخص ایثار کرکے محض ثواب کے لیے یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لے۔

"اللہ تعالیٰ ہمیں کامیاب کرے۔" "آمین!"

اندیشے

اب جبکہ تم نے پوری بات سمجھ لی ہے اور تم دونوں بھی ان سچائیوں کو مان چکی ہو تو لو، اب میں بتاتا ہوں کہ میں ایک عرصے سے کہاں جاتا رہا، کس سے باتیں کرتا رہا اور خود کیا کرتا رہا در اصل میں جب صبح ناشتہ کر کے گھر سے نکلتا ہوں تو نور پور جاتا ہوں نور پور یہاں سے نو میل پر ایک گاؤں ہے۔ اس گاؤں میں سب مسلمان ہی بستے ہیں۔ اس گاؤں میں ایک مسجد بھی ہے ـــــ مسجد کا مُلّا پڑھا لکھا آدمی ہے۔ وہ پانچوں وقت کی نماز بھی پڑھاتا ہے اور ایک مکتب بھی چلاتا ہے۔ مکتب میں بچوں کو انہیں باتوں کی تعلیم دیتا ہے جو بہت دنوں سے میں تم دونوں کو بتاتا رہا ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ ساری باتیں قرآن کی ہیں، جن کو جب تم نے سُنا تو "ستیہ ہے" تمہاری زبان سے نکلا۔ میں تم کو بتا چکا ہوں کہ یہ باتیں خدا نے حضرت محمدؐ پر اُتاریں اور حضرت محمدؐ نے دنیا والوں کو بتائیں، اور سمجھائیں۔ میں نے اچھی طرح اطمینان کر لیا ہے۔ حضرت محمدؐ واقعی

اللہ کے رسول ہیں۔ میں ان کے بارے میں تم کو بہت کچھ بتا چکا ہوں۔ آج میں کچھ ایسی باتیں بتاؤں گا جو اس ہفتہ میں نے مُلّا صاحب سے سنیں۔ بات شروع اس طرح ہوئی کہ آج میں نے قرآن کی کچھ باتیں سمجھائیں تو میری زبان سے نکل گیا "محمدؐ صاحب نے یہ بڑی اچھی کتاب لکھ کر دنیا والوں کو دی۔" میرے یہ کہنے سے مُلّا صاحب چونکے۔ میں نے تعریف کے طور پر یہ بات کہی تھی لیکن ان کو چونکتے دیکھ کر مجھے کھٹکا پیدا ہوا کہ شاید کہنے میں بات کچھ غلط ہو گئی۔ سچ مچ میں نے بات غلط کہی تھی۔"

اس میں غلط بات کیا تھی۔ مجھے جتنا کچھ تم نے بتایا ہے اسے جان لینے کے بعد میں بھی کہہ سکتی ہوں کہ محمدؐ صاحب نے بہت اچھی کتاب لکھی۔"

یہی تو ہم تم غلط سمجھے۔ مُلّا جی نے بتایا کہ محمدؐ صاحب لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔"

بڑے آشچریہ اور تعجب کی بات ہے ایک بے پڑھا آدمی ایسے بول کہے جو ایک طرف ایسے ستیہ ہوں اور دوسری طرف ایسے سادہ کہ دل میں اُتر جائیں۔

تمہیں ایک بات اور بتاؤں۔ مُلّا جی سے میں بحث کرنے لگا کہ قرآن کیا سچ مچ خدا کی کتاب ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ دنیا بھر میں جتنے لوگوں نے جو کتاب لکھی لکھنے کے بعد اُسے اس لیے پھر پڑھا کہ اگر اس میں کچھ غلطی رہ گئی ہو تو اُسے ٹھیک کر لیا جائے۔ اس کے بعد کتاب چھپنے کو دی لیکن محمدؐ صاحب کو ایسا نہیں کرنا پڑا۔ بس پہلے پہل جو بول ان کی زبان سے نکل گئے۔ پڑھے لکھے لوگوں نے سُنے اور انہوں نے لکھ لیا اور بہت سے لوگوں نے زبانی یاد کر لیا۔ یہی قرآن آج تک چلا آرہا ہے۔"

یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے۔ میں جب دادّا کو خط لکھتی ہوں تو اس ذرا سے خط کو بار بار پڑھتی ہوں اور ٹھیک کرتی ہوں۔ اتنی بڑی کتاب کتنے برس میں تم بتا رہے تھے کہ پوری ہوئی، ۲۳ برس میں نا! تو اب تک اسے پڑھا جا رہا ہے ـــ

مسلمانوں کے بڑے بڑے ودّوان پڑھ رہے ہیں اور نہ جانے کیسے کیسے قابل لوگوں نے اُسے پڑھا ہوگا۔ کسی نے ایک غلطی بھی نہ نکالی اس میں۔"

آشا کی ماں! بس اسی بات نے مجھ کو یہ ماننے پر مجبور کر دیا کہ یہ کتاب خدا کی طرف سے اتری ہے اور حضرت محمدؐ خدا کے رسول ہیں۔ رسول کے بارے میں میں تم نا دونوں کو سمجھا چکا ہوں کہ وہ خدا کی طرف سے لوگوں کو ٹھیک راہ دکھانے کیلئے بھیجا جاتا ہے اور اس کے پاس خدا۔ کے فرشتے آتے ہیں۔"

"بابوجی! وہ بات یاد ہے؟"

"کون سی بات آشا؟"

وہ جو کنوار کے مہینے میں ایک کوی ہمارے گاؤں میں آیا تھا' اس نے بڑی اچھی کوِتا سُنائی تھی۔ سارے ہی لوگ اس کی تعریف کر رہے تھے۔ پھر دو ڈھائی مہینے بعد معلوم ہوا کہ وہ کوِتا چور تھا۔ دوسرے کویوں کی بنائی ہوئی کوِتا لوگوں کو سنا کر اپنی تعریف کراتا پھرتا ہے۔"

"آشا! وہ اس وقت تم کو کیسے یاد آگیا؟"

بابوجی! میں یہ سوچ رہی ہوں کہ لوگ دوسروں کی بنائی ہوئی کوِتا اپنے نام سے پڑھ دیتے ہیں وہ سب اپنا نام کرنے کیلئے ایسا کرتے ہیں لیکن محمدؐ صاحب نے خدا کے بولوں کو اپنے بول نہ بتائے۔ اگر وہ کہہ دیتے کہ یہ بول خود میرے بنائے ہوئے ہیں تو کون انکار کر سکتا تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمدؐ صاحب سچے تو تھے ہی۔ وہ بڑے امانت دار بھی تھے اور وہ اپنا نام کرنے کے بدلے خدا کا نام بلند کرنا چاہتے تھے۔"

بیس بائیس برس کی لڑکی کی زبان سے اتنی سمجھداری کی بات سُن کر ماں باپ دونوں دنگ رہ گئے۔ ماں نے بڑھ کر اس کا منھ چوم لیا۔ باپ بھی بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد یہ مشورہ ہونے لگا کہ جب ہم سب نے خدا کو ایک مان لیا۔ یہ بھی جان لیا کہ خدا

کے ایک ہونے کے معنی کیا ہیں؟ یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ مورتی پوجا کے بدلے بھگوان ہی کی پوجا ہونا چاہیئے اور اسی مالک کو خوش کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے اور یہ بات دل نے قبول کرلی کہ ایک دن ایسا آکر رہے گا جب ہر شخص کو اس کے کرموں کا حساب اس مالک کے سامنے دینا ہوگا۔ اس کے بعد جنت ہے یا جہنم اور اس بات پر بھی اچھی طرح یقین کرلیا کہ حضرت محمد صاحبؐ خدا کے واقعی رسول ہیں تو پھر اب ہم سب کو کیا کرنا چاہیئے؟

"ٹھاکر! میں بتاؤں کیا کرنا چاہیئے؟"

"ہاں بتاؤ۔"

"میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ جو سچائی ہمارے سامنے آچکی ہے اُسے سویکار کرلینا چاہیئے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سب مسلمان ہوجائیں؟"

"اور کیا مطلب ہوسکتا ہے؟" کانتا نے شوہر سے کہا اور ٹھاکر سر نیچا کر کے کچھ سوچنے لگا۔ اس کے بعد اس نے کہا "میں کئی ہفتوں سے یہی بات سوچ رہا ہوں۔ میرا دل اور میرا ذہن اور میرا دماغ مجھ سے کہہ رہا ہے کہ مسلمان ہوجانے ہی میں بھلائی ہے لیکن مجھے کئی باتوں نے اب تک روک رکھا ہے۔"

"وہ باتیں کیا ہیں؟"

پہلی بات تو یہ کہ اگر میں مسلمان ہوجاؤں اور تم لوگ مسلمان نہ ہو تو مجھے تم سب کو چھوڑنا پڑے گا۔ پھر تم میری نہیں رہ سکتی ہو۔"

"تم اس طرح سوچنے کے بدلے یوں کیوں نہیں سوچتے کہ میں بھی مسلمان ہوجاؤں گی۔"

"اور تم بتاؤ آشا؟"

"بابو جی! مجھ سے اگر پوچھتے ہو تو میں سب سے پہلے اس کے لئے تیار ہوں

کیوں کہ میں نے سُنا ہے کہ اسلام میں عورتوں کے بڑے حق رکھے گئے ہیں جب کہ ہمارے یہاں کچھ نہیں۔"

"ہاں" وہ تو ہیں، میں نے خود اس طرح کی کئی باتیں تم لوگوں کو بتائیں لیکن مسلمان ہونے سے ایک کٹھن بات اور ہمارے سامنے آئے گی۔"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ للّا ابھی نابالغ ہے۔ ہمارے دیس کا قانون ہے کہ اگر کوئی شخص اپنا مذہب تبدیل کر دے تو اس کی نابالغ اولاد اسی پچھلے مذہب ہی میں رہے گی۔"

ٹھاکر نے یہ بات کہی تو کانتا اور آشا کی حالت ایسی ہوگئی جیسے ان کو سانپ سونگھ گیا ہو۔" میرے کلیجے کو لوگ میرے سینے سے نوچ لیں گے۔" کانتا کی زبان سے نکلا اور وہ چپ ہو کر رہ گئی۔

تینوں گھر کے اندر بالکل چُپ تھے۔ بہت دیر تک یہ خاموشی رہی۔ تینوں اپنی اپنی جگہ نہ جانے کیا کیا سوچتے رہے۔ پھر ٹھاکر نے اس سے زیادہ دُکھ دینے والی بات بتائی۔ ٹھاکر نے کہا۔

ایک مصیبت اور ہے۔ ہمارے دیس کے قانون میں یہ تو ہے کہ جو شخص جو مذہب چاہے چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرلے لیکن دیکھا یہ جاتا ہے کہ جب کوئی ہم میں کا آدمی مسلمان ہو جاتا ہے تو ہم اس کا مسلمان ہونا برداشت نہیں کر پاتے اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہم نے ایک فساد لا کھڑا کیا۔ مسلمان ہونے والے کو تو ستایا ہی لیکن اس سے جی نہ بھرا تو دوسرے مسلمانوں پر ہلّہ بول دیا اور ان کا جانی و مالی نقصان کر کے اپنا غصّہ ٹھنڈا کیا۔ یہ بھی سوچتا ہوں کہ اگر ہم لوگ مسلمان ہو جائیں اور للّا کو اس وقت تک کے لیئے کسی ایسی جگہ بھیج دیں جہاں وہ بالغ ہونے تک آرام سے رہے اور انہی باتوں کو سیکھتا رہے اور پڑھتا رہے جن کو ہم سچ مان چکے ہیں اور پھر ہم اپنے مسلمان ہونے کا اعلان

کر دیں تو ہمارے بھائی بند ہم سب کی جان کو آجائیں گے اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آس پاس کے گاؤں میں جو کچھ مسلمان بستے ہیں ان پر غصہ اتارا جائے اور میں یہ بھی بتا دوں کہ نور پور کی تو خیر نہیں کیونکہ بہت سے لوگ یہ جان چکے ہیں کہ میں وہاں جاتا ہوں۔ فوراً سمجھ جائیں گے میں نور پور کیوں جاتا رہا۔"

"ٹھاکر! تم کہتے تو بہت ٹھیک ہو۔ یہ سارے اندیشے تو ہیں۔"

"بابو جی! ایسا کیوں نہ کیجئے کہ یہ گاؤں چھوڑ دیجئے اور کہیں اور جا کر بس جائیے اس کے بعد ہم سب مسلمان ہو جائیں۔

"ہاں بیٹی! یہ تو ہو سکتا ہے لیکن اس میں ابھی کچھ دنوں کی کسر ہے۔"

"کسر کیا ہے بابو جی؟"

"کیا بتاؤں بیٹی! اپنی اس عمر تک میں نے جو کرتوت کر رکھے ہیں ان کے کارن تم دیکھتی ہو کہ ہر رات کو جگایا جاتا ہوں۔ سپاہی آتے ہیں مجھ کو پکارتے ہیں۔ باہر بلا کر دیکھ لیتے ہیں۔ تب جا کر انہیں اطمینان ہوتا ہے کہ "بدمعاش" گھر پر ہی ہے۔ دیکھو بھئی میں کب تک ہسٹری شیٹر رہوں۔ میں نے اس سلسلے میں بہت سارو پیہ خرچ کیا ہے۔ مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ابھی پانچ چھ مہینے لگ جائیں گے۔"

یہ کہہ کر ٹھاکر نے ایک لمبی سانس لی۔ اس کے بعد کہنے لگا۔ وہی خدا ہمارا مالک ہے جس نے ہمیں سیدھا راستہ دکھایا۔ اب میں یہ سوچتا ہوں کہ اپنے پرانے محسن کو ایک خط لکھ دوں اور جیل سے لے کر اب تک میرے خیالات میں جو تبدیلیاں آتی رہی ہیں وہ سب اور اس وقت جو کیفیت ہے وہ ساری کی ساری لکھ دوں اور اس کا جواب نور پور کے پتہ پر ملا صاحب کے نام منگاؤں۔"

"وہ کون صاحب ہیں؟" کانتا اور آشا نے ایک ساتھ ٹھاکر سے پوچھا۔ ٹھاکر نے بتایا کہ وہی جنہوں نے جیل میں خدا کے قانون کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں ان کو

گا کہ میں نے خدا کا قانون تلاش کر لیا ہے لیکن اس کو اختیار کرنے میں یہ اور یہ اندیشے سامنے آرہے ہیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟

گھر کے اندر ہی طے پا گیا کہ جب تک ان صاحب کا جواب نہ آجائے اس وقت تک اسی طرح خاموش رہنا چاہیئے ویسے جہاں تک دل میں اسلام قبول کرنے کی بات تھی تینوں مسلمان ہو چکے تھے۔

گھر میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ باہر سے للّا دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے آکر کہا۔ "بابوجی! مکھیا بلا رہے ہیں۔" للّا سے یہ سُن کر ٹھاکر اُٹھ کھڑے ہوئے مکھیا کے پاس پہنچے۔ مکھیا نے پوچھا "ٹھاکر سنا ہے تم زمین بیچ رہے ہو۔"

"ہاں بیچ تو رہا ہوں۔"

"کیوں؟"

مکھیا کاکا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میں نے اب وہ پیشہ چھوڑ دیا ہے جو سراسر پاپ ہے لیکن مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ یہاں میں ڈاکو ہی کہا جاتا رہا ہوں۔ لوگ سدا مجھ پر انگلیاں ہی اٹھاتے رہیں گے اس لیے سوچتا ہوں کہ ایسی جگہ جا بسوں جہاں کے لوگ مجھے نہ جانتے ہوں۔"

"اور اپنے نام کا کیا کرو گے؟"

"اپنا نام بدل دوں گا۔ نام میں کیا دھرا ہے مکھیا۔ منش کے کرم اچھے ہوں۔"

اچھا جب تم زمین بیچنا تو اس کا گاہک مجھے بھی سمجھنا۔ جو دام لگیں۔ اس سے ایک ہزار زیادہ مجھ سے لے لینا۔"

"لیکن زمین بیچنے میں دیر ہے۔"

"کیا دیر ہے؟"

کاکا تم جانتے ہو۔ میں ہسٹری شیٹر ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ کلنک کا ٹیکہ

ماتھے سے چھوٹے تو کہیں باہر جانے کو سوچوں۔ کیا فائدہ کہیں جا کر رہوں تو وہاں بھی تلنگے مجھے جگاتے پھریں۔"

"تم نے بڑے داروغہ سے نہیں کہا؟"

"اپنے منہ سے میں کیا کہوں۔"

"پھر کون کہے؟"

"کاکا! وہ تو تم سے پوچھ گچھ کرتا رہتا ہے۔ تم خود کیوں نہیں کہہ دیتے۔ تم کہہ دو کہ اب یہ ٹھیک ٹھاک رہ رہا ہے تو تھانیدار یہی لکھ بھیجے گا اور پھر کپتان ضرور میری نگرانی کرانا ختم کر دے گا۔"

"اچھی بات ہے، میں اس سے کہوں گا۔"

"تو پھر میری زمین اپنی ہی سمجھو کاکا۔"

وہ تو مجھے یقین ہے کہ تم میری بات نہیں ٹالو گے۔ تم سچ مچ بڑے اچھے ہو گئے ہو ٹھاکر!"

"یہ سب آپ بڑے بوڑھوں کا آشیرباد ہے اور بھگوان کی دیا ہے۔"

"ہاں ٹھاکر! بات تو یہی ہے۔ اچھا تو زمین بیچتے وقت خیال رکھنا!"

"ضرور ضرور کاکا! اور تم بھی اب کی بار داروغہ سے ملو تو خیال رکھنا!"

"ضرور ضرور، تم اطمینان رکھو۔"

اس بات چیت کے بعد ٹھاکر نے گھر آ کر بیٹی اور بیوی سے مکھیا کی ساری باتیں بتا دیں اور امید دلائی کہ خدا نے چاہا تو بہت جلد میں آزاد ہو جاؤں گا۔"

"بھگوان ایسا ہی کرے۔" کانتا کی زبان سے نکلا اور وہ آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔

ردِّ عمل

سنجیدہ طبقے کے لوگ بالغ اور تعلیم یافتہ اولاد سے ان کی شادی کے بارے میں مشورہ لینا جتنا ضروری سمجھتے ہیں، نابالغ اولاد کے سامنے ان کی شادی کا تذکرہ کرنے سے اتنا ہی گریز کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نابالغ بچوں کے سامنے ان کی شادی کا تذکرہ کرنے سے تعلیمی اور تربیتی دونوں طرح کا نقصان ہوتا ہے۔ نابالغ بچہ شادی کے مسئلے کو سمجھتا تو ہے نہیں۔ وہ یہ تک نہیں جانتا کہ شادی کیوں کی جاتی ہے۔ لیکن جب اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی شادی ہونے والی ہے تو وہ ایک خیالی دنیا میں ایسی جگہوں تک پہنچ جاتا ہے جہاں اس کے ہاتھ اگر کچھ آتا ہے تو وہ قبل از وقت محض ایک موہوم لذت ہوتی ہے۔ وہ اپنے حلقۂ احباب میں بڑے فخر کے ساتھ اپنے کو پیش کرتا ہے اس کے حلقۂ احباب میں جو لڑکا شادی شدہ ہوتا ہے اُس سے وہ شادی کے موضوع پر گفتگو کرتا ہے پھر اسے وہ سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے جو اُسے ابھی نہیں معلوم ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد اس سے ایسی حرکتیں سرزد ہونے لگتی ہیں جن کو اس کے سرپرست پسند نہیں کرتے لیکن بعض مجبوریاں ایسی سامنے آجاتی ہیں کہ پھر جلد

سے جلد اس کی شادی کر دینا ہی مفید سمجھتے ہیں اور جہاں وہ چاہتا ہے وہاں۔

یہی حال لکھنؤ کے مرشد علی خاں صاحب کے "فرزند ارجمند" کا ہوا۔ ان کی عمر ہنوز سولہ سترہ سال ہی کی تھی کہ ان کی والدہ صاحبہ کی رگ ارمان پھڑکی اور کہاں؟ ضمیر صاحب کے یہاں ان کی لڑکی رضیہ کے لیے۔ پھر انہوں نے اپنے شوہر مرشد علی خاں صاحب کو بھی ہموار کر لیا۔ چونکہ ان کے چھوٹے بھائی راشد علی خاں صاحب سے ضمیر صاحب کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ اس لیے انہی کو واسطہ بنایا۔ بیوی نے جب تک مرشد علی خاں صاحب سے ان کے بھائی کے نام خط نہ لکھا لیا اس وقت تک ناک میں دم کیے رکھا بہت سمجھایا گیا کہ ابھی دونوں بچے ہیں۔ ابھی سلسلہ جنبانی ٹھیک نہیں لیکن وہ جو تریا ہٹ مشہور ہے۔ بیوی کو یہ ضد ہو گئی کہ کسی طرح بات پکی کر لی جائے۔ شادی چاہے جب ہو۔ مرشد علی خاں صاحب نے بیوی کے بار بار کہنے سے بھائی کو خط لکھ دیا۔ جواب خط آیا تو دونوں پر جو رد عمل ہوا وہ ایک خطرناک باب کی تمہید بنا۔ خط پاکر مرشد علی خاں مضمونِ خط سے بیوی کو آگاہ نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن جب آئے دن "جواب آیا؟ جواب آیا؟" پوچھا جانے لگا تو ایک دن جھلا کر جواب دیا۔ "ہاں آگیا"

"تو کیا لکھا ہے راشد نے؟" بیوی نے پوچھا۔

"وہی، جس کا مجھے اندیشہ تھا۔"

"یعنی کیا راشد نے پتہ کاٹ دیا۔"

"ہاں پتہ کٹا ہوا ہی سمجھو۔ تمہاری جلد بازی سے میری بات بھی گئی۔"

"بات گئی! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ راشد تم سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ ذرا خط مجھے سناؤ۔"

مرشد علی خاں صاحب نے جیب سے خط نکالا اور اس طرح بیوی کو سنانے لگے۔

مکرم و معظم جناب بھائی صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

گرامی نامہ ملا۔ پڑھ کر آپ کی خیریت معلوم ہوئی۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ سب صاحبان بخیریت لکھنؤ پہنچ گئے۔ ہم لوگ بھی یہاں بفضلہ عافیت سے ہیں اور جب کبھی گھر میں ایک جگہ بیٹھتے ہیں تو آپ کے اور آپ کے اہل و عیال کے تذکرے نہایت محبت سے کرتے ہیں۔ میں انہیں آپ کی اس شفقت کے واقعات سنایا کرتا ہوں جس کی بدولت میں پروان چڑھا اور اتنا بڑا ہوا۔ آپ کی اس محبت اور مہربانی کے لیے میں اللہ تعالیٰ کا بہت بہت شکر ادا کرتا ہوں اور آپ کے لیے بڑی دعائیں کرتا ہوں۔

بھائی صاحب! میں آپ کی مہربانیوں اور شفقتوں سے اتنا مرعوب ہوں کہ آپ کے حکم سے سرتابی گناہ سمجھتا ہوں پھر بھی اپنی جسارت کی معافی مانگتے ہوئے عرض کروں گا کہ اس خط میں ارشد سلمہٗ کی شادی کے سلسلے میں آپ نے جو بات لکھی ہے وہ بہت ہی قبل از وقت معلوم ہوتی ہے۔ ارشد سلمہٗ کی عمر ہی کیا ہے اور رضیہ ابھی کتنی ہے میں تو ان کی شادی کے بارے میں ابھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ابھی سے بات پکی کرنے کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ خدا جانے کل کیا ہو۔ لڑکی آگے چل کر کیسی نکلے اور لڑکے کا رجحان نہ جانے کیا ہو۔ زیادہ اچھا یہی ہے کہ جب دونوں اس عمر کو پہنچیں تب سلسلہ جنبانی شروع ہو۔ زمین ہموار ہوتی ہے تو اس پر چلنا بھی آسان ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں بھابی جان سے ایک سہو ہو گیا۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ ایک عقل مند خاتون سے یہ چوک کیسے ہو گئی؟ انہوں نے جان کر تو نہیں، شاید ارشد سلمہٗ کے سامنے بھول کر تذکرہ کر دیا یا وہ کسی سے تذکرہ کر رہی ہوں اور اس نے سن لیا ہے۔ کچی عمر میں اپنی شادی کی چھیڑ چھاڑ سنی تو اس کی امنگوں میں جو ابھار آیا اس کا ایک نمونہ اس نے یہ دکھایا کہ وہ آپ سے چھپ کر ایک دن یہاں آدھمکا اور اس کوشش میں رہا کہ رشاد کو ساتھ لے کر رضیہ کے ساتھ کھیلے۔ میں آپ سے عرض کردوں کہ باقاعدہ تو نہیں لیکن ضمیر صاحب اب اپنی بیٹی میں پردہ کی عادت ڈالنے لگے ہیں۔ رشاد چونکہ اس کا ہم عمر ہے

اس لیے اس کے ساتھ تو کھیلنے کی اجازت ہے۔ یہ اجازت زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سال اور رہ سکتی ہے اس کے بعد وہ بھی اس کے ساتھ نہیں کھیل سکتا کجا ارشد سلمہٗ جن کی عمر ۱۷ سال کی ہو چکی، ضمیر صاحب کیسے گوارا کریں گے کہ ان کی بیٹی غیر لڑکے کے ساتھ کھیلے پھر وہ لڑکا جو عنقریب بالغ ہونے والا ہو۔ ارشد سلمہٗ نے کچھ اس طرح رشاد کو مجبور کیا کہ اس نے اپنی ماں سے کہا اور پھر بات مجھے معلوم ہوئی میں نے اس مسئلے کو اسی جگہ دبا دیا۔ ارشد سلمہٗ کو بحسن اسلوب سمجھا دیا اور لکھنؤ واپس کر دیا۔ میرے خیال میں یہ جذبات ارشد سلمہٗ کے اندر ابھار دینا اچھا نہیں ہوا۔ آپ کو اس لیے کچا چٹھا لکھ دیا تاکہ آپ اس کا انسداد فرما سکیں۔ رہی شادی کی بات وہ انشاءاللہ وقت آنے پر جیسا مناسب ہوگا دیکھ بھال اور سوچ سمجھ کر کی جائے گی۔ مُلکِ خدا تنگ نیست۔ والسّلام یہاں سب کی طرف سے وہاں سب کو نام بہ نام سلام و دعا کہیے گا اور اپنی خیریت سے جلد جلد مطلع فرماتے رہئیے گا۔

والسّلام راشد

خط سنانے کے بعد مرشد علی خاں صاحب نے بیوی سے کہا ارشد نے بہت بُرا کیا کہ اس نیت سے وہاں گیا۔ اس احمق نے تو مجھ سے کہا تھا کہ دو دن کے لیے پکنک کو جا رہا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اس بہانے وہاں جا دھمکے گا اور وہاں اپنی حماقت سے ہماری سُبکی کا باعث بنے گا۔

مرشد علی خاں صاحب خط پڑھنے کے بعد اپنی بات کہہ کر چُپ ہوئے تو رئیسہ سُلطانہ نے ایک لمبی سانس لی۔ رئیسہ سلطانہ مرشد علی خاں صاحب کی رفیقۂ حیات تھی۔ وہ ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ بڑی ہوشیار اور کلّے ٹھلّے کی عورت تھی۔ بیٹے کی حرکت پر دل ہی دل میں جز بز تو ہوئی لیکن ”بچہ ہے“ کہہ کر اُس احساس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگی جو سر دست پیدا ہوا تھا اس نے افسوس اس پر ظاہر کیا کہ واقعی ہماری سُبکی ہوئی اور اُس بھائی نے بات لوٹا دی جس سے یہ اُمید نہ تھی۔“

"بے شک یہ امید نہیں تھی مگر میں نے جو کہا اس کے پس پردہ وہی بات ہے۔"

"یعنی یہ کہ راشد رضیہ کو اپنی بہو بنانا چاہتا ہے۔"

"ہاں میرا خیال یہی ہے۔ اسی لیے میں اس طرف توجہ نہیں کرتا تھا مگر تم نے اصرار کر کے خط لکھوایا اور اس کا یہ جواب ہمیں مل گیا۔"

"تو کیا تم یہ برداشت کر لو گے اور ٹھنڈے دل سے راشد کو مبارک باد دے سکو گے۔"

"ارشی کے لیے بہت سی لڑکیاں مل جائیں گی۔ لڑکیوں کی کمی کیا ہے۔ تم نہ جانے کیوں رضیہ پر ریجھی ہو۔"

"اب ریجھنے کی بات الگ رہی۔ اب تو بات کی بات ہے چھوٹے بھائی کے مقابلے میں بڑے بھائی کی سُبکی تو اس دن ہو گی جب رشاد کی شادی رضیہ کے ساتھ ہو گی اور تم منہ تکتے رہو گے۔"

"تو اس میں میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ اپنے بیٹے بیٹی کی شادی جہاں چاہے کرے۔"

"نہ اس طرح خاموش رہنا صحیح نہیں ہے۔ دنیا میں بات ہے تو سب کچھ ہے مشکل یہ ہے کہ میں یہاں کئی جگہ بتا بھی چکی ہوں کہ ارشی کے لیے لڑکی منتخب کر لی ہے۔"

"یہ تم نے کیا غضب کیا۔ اب اور زیادہ سُبکی ہو گی۔ میں چاہتا تھا جب بات طے ہو جائے تب لوگوں سے کہا جائے تم نے بڑی ناسمجھی کا ثبوت دیا۔"

اب اسے ناسمجھی سمجھو یا کچھ اور۔ اب تو بات رکھنی ہے اور اگر ہماری بات نہ رہی تو راشد میاں کا ارمان بھی پورا نہ ہو سکے گا۔"

"تم کیا کر لو گی؟"

میں عورت ذات کیا کر سکتی ہوں لیکن یہ جانتی ہوں کہ میرا میاں پولیس انسپکٹر

رہ چکا ہے۔ اب تک تو یہ دیکھا ہے کہ اس نے جس بات کا تہیہ کر لیا پورا کر کے رہا تو کیا یہ اتنی سی بات نہ کر سکے گا۔"

"میں نے ملازمت سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد وہ سارے ہتھکنڈے چھوڑ دیئے جو اس محکمے میں چار و ناچار کرنا پڑتے تھے۔ اب اُن سے توبہ کر لی ہے۔ آخری عمر میں کچھ اللہ اللہ کر کے ان گناہوں کو دھونا چاہتا ہوں جو کر چکا ہوں۔"

یہ تو ٹھیک ہے۔ گناہ تو اب بھی ہوتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ بڑا کریم ہے۔ اس نے توبہ کا دروازہ بند نہیں کیا ہے۔ توبہ تو ہر وقت کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں تمہیں کچھ نہ کچھ کرنا ہی چاہیئے۔

"کون اس کھکھیڑ میں پڑے جی! وہاں میرا دل بھی تو نہیں ٹھُکتا۔ وہ لوگ ہمارے مذاق کے بھی تو نہیں۔ تم بھی ان کا خیال چھوڑ دو۔"

"چھوڑ تو دیتی لیکن اب اس بے عزتی کا جواب تو دینا ہی ہے جو نہایت خوبصورت لفظوں میں راشد نے ہماری کی۔"

"تو مجھے بتاؤ تو، میں کیا کروں؟"

"کم سے کم اتنی اجازت تو دو کہ میں یہاں جن لوگوں سے کہہ چکی ہوں ان سے کہہ دوں کہ ارشی کی نسبت فلاں جگہ طے ہو چکی ہے۔"

"غلط بات مشہور کرنے سے آگے چل کر اور بھی بے عزتی ہو گی ایسا ہرگز نہ کرنا۔ خبردار!"

میں نے تم کو بتایا نہیں میں تو پاس پڑوس میں کہہ بھی چکی کہ ارشی کے ابا نے اس کی نسبت طے کر لی۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو اسے نبھانا ہے جس طرح نبھایا جا سکے۔"

لاحول ولا قوۃ، عجیب ضدن سے پالا پڑا ہے۔ اچھا تو تم ہی یہ مہم سر کر دو اور

مجھے اس مسئلے میں معاف ہی رکھو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بہرحال کرنا تم کو ہی پڑے گا۔ چاہے خوشامد کراؤ یا بخوشی کرو۔"

"مگر کامیابی کی توقع تو ہو تب تو میں کروں۔"

"میں جانتی ہوں، تم ارادہ کر لو گے تو کر کے ہی چھوڑو گے۔"

"بہرحال میں وعدہ تو نہیں کرتا مگر سوچوں گا۔"

"تمہارا سوچنا ہی میرے لیے وعدہ ہے۔ اب مجھے اطمینان ہو گیا۔"

"کیا اطمینان ہو گیا؟"

"یہی کہ راشد میاں نے جو یہ ٹکا سا جواب دیا ہے اس کا ردعمل وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"میں جانتی ہوں، تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو پہلے کہتے ہیں اور پھر کرتے ہیں۔" تم جب کر چکتے ہو تب کہتے ہو۔"

"کرنا تو تم کو بھی یہی چاہیئے تھا مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"خیر وہ تو بھول مجھ سے ہو گئی۔ اب اسے نبھانا ہے۔ میری تمہاری عزت ایک ہی تو ہے۔"

"اچھا، اب مجھے سونے دو۔"

"تو سو جاؤ نا!"

"شکریہ!" شب بخیر۔"

کردار کا اثر

"رشاد!" .... "زندہ باد"!!

ہندو مسلم سکھ عیسائی .... "بھائی بھائی"

"اتحاد" .... "زندہ باد"!!

سکینہ ہائر سکنڈری اسکول .... "زندہ باد"!!

"رشاد"! .... "زندہ باد"!!

حولدار راشد علی خاں اس وقت ضمیر صاحب سے اپنے ادارہ خدمت بیوگان کے سلسلے میں مشورہ کر رہے تھے۔ مریم بھی وہیں آئی ہوئی تھی۔ رضیہ منی کے ساتھ کھیل رہی تھی یا وہ اسے کھلا رہی تھی۔ اچانک نعروں کا شور سنائی دیا۔ "رشاد زندہ باد" کا نعرہ سن کر سب کے سب چونک پڑے۔ "یہ کیا؟" ہر ایک کی زبان سے نکلا۔ حولدار صاحب اور ضمیر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور گھر سے باہر نکل کر دیکھنے لگے ایک جلوس مسٹر سکینہ

ہیڈ ماسٹر سکینہ ہائر سکنڈری اسکول کی قیادت میں اسی طرف آرہا تھا اسکول کا اسٹاف طلبہ اور بہت سے دوسرے افراد بلا امتیاز مذہب اس جلوس میں شامل تھے۔ جلوس کے آگے رشاد اپنے استادوں کے بیچ میں تھا اس کے گلے میں بہت سے ہار اور گجرے پڑے تھے اور بہت سے گجرے وہ اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے تھا۔

جلوس والوں نے ضمیر صاحب اور حولدار صاحب کو سامنے کھڑے دیکھا تو انہوں نے نعروں کے زور وشور میں اضافہ کر دیا۔ گھر کے سامنے کھڑے ہوئے یہ دونوں دوست حیرت کے ساتھ ان سب کو دیکھ رہے تھے اور گھر کے اندر صدر دروازے کی آڑ سے چار آنکھیں بھی اس جلوس کو دیکھنے کے لیے بیتاب ہو رہی تھیں۔ رضیہ منی کو لیے ہوئے دروازے سے نکل آئی اور باپ کے پاس جاکر کھڑی ہوگئی۔

"امی جان! رشاد میاں ہار پہنے ہیں۔ دیکھئے تو بہت سارے لوگ ہیں"۔ وہ چیخ پڑی۔

جلوس ضمیر صاحب کے دروازے پر آکر رک گیا۔ ضمیر صاحب نے بڑھ کر ہیڈ ماسٹر صاحب سے ہاتھ ملایا۔ حولدار صاحب بھی ملے اور پوچھنے لگے:۔

"جناب! اس جلوس کا پس منظر سمجھ میں نہیں آیا؟"

سکینہ صاحب نے اسی جگہ سے جلوس کو ترپاٹھی کی قیادت میں واپس کر دیا اور خود صورتِ حال بتانے کے لیے دوسرے اساتذہ کے ساتھ رک گئے۔ ضمیر صاحب نے بڑے اعزاز کے ساتھ سب کو اپنے ملاقاتی کمرے میں بٹھایا۔ رشاد گھر کے اندر چلا گیا۔ اُس وقت رضیہ اُسے دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ وہ کبھی اس کے گلے میں پڑے ہوئے ہاروں کو ہاتھوں سے چھوتی اور کبھی گجروں کے پھول دیکھتی۔ رشاد نے بہت سے ہار اور گجرے اس کے گلے میں ڈال دے۔

اوئی اللہ! رضیہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے بعد مریم اور ملانی صاحبہ اُسے

لے کر برآمدے میں تختوں پر بیٹھ گئیں۔ ملّانی نے رضیہ سے کہا۔ "بیٹی! آگ جلا کر پانی گرم کرنے کو رکھ دو! شاباش بیٹی! اس کے بعد رشاد سے احوال واقعی پوچھنے لگیں۔ وہ بتاتے ہوئے شرما رہا تھا۔ یہ دیکھ دونوں باہری نشستگاہ کی کھڑکی سے لگ کر بیٹھ گئیں اور پردہ کھینچ کر سننے لگیں۔ مسٹر سکینہ کہہ رہے تھے۔

"حولدار صاحب! ہمیں فخر ہے کہ رشاد جیسا طالب علم ہمارے اسکول میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ آج اس نے وہ کارنامہ انجام دیا کہ ہم بڑے بڑوں سے بن نہیں آ رہا تھا۔ ہم سب گھبرائے ہوئے تھے کہ کہیں فرقہ وارانہ فساد ہمارے اسکول سے نہ پھوٹ پڑے مگر بھگوان نے بڑی دیا کی۔ اس ننھے سے بچے کی حق گوئی نے فساد کی آگ اس طرح بجھا دی کہ ہمارے اسکول سے ہمیشہ کے لیے فساد کا خاتمہ ہو گیا۔ اس لیے ہم آپ کے ممنون ہیں کیونکہ یہ اس تعلیم کا اثر ہے جو آپ نے رشاد کو گھر پر دی ورنہ آپ جانتے ہیں کہ اسکول میں پڑھائی جو کچھ ہوتی ہے وہ کیسی ہوتی ہے اور وہ جو تربیت کا نظم ہمارے آپ کے بچپن میں تھا، بالکل چوپٹ ہے۔ اُستاد نہ بچوں کی پروا کرتے ہیں اور نہ لڑکے اُستادوں کا احترام۔ آئے دن سی بات پر ہنگامہ ہوتا رہتا ہے۔ پھر کچھ سیاسی تحریکوں اور فرقہ پرست عناصر کو اُسے ہوا دینے کا موقع مل جاتا ہے، وہ اپنے اغراض و مقاصد کے تحت انسانیت کا خون کرنے میں زندوں نومات کر دیتے ہیں۔"

ضمیر صاحب اور حولدار صاحب سکینہ جی کی زبان سے یہ شستہ اُردو سن کر دنگ رہ گئے۔ دونوں خاموشی سے سنتے رہے سکینہ بابو نے سانس لیتے ہوئے پھر کہا۔

آپ دونوں صاحبان مشتاق ہوں گے کہ میں بتاؤں، واقعہ کیا ہوا۔ بات تو کچھ بھی نہ تھی لیکن آج کل بچوں کی ذہنیت ہی بگڑ رہی ہو۔ یا بگاڑی جا رہی ہو تو کیا عرض کیا جائے۔ دیکھتے دیکھتے بات کا بتنگڑ ہو گیا۔ رمیش کا قلم گم ہو گیا تھا۔ تلاشی لینے کے بعد قادر کے پاس نکلا۔ قادر بولا "یہ تو میرا ہے" اور رمیش کہہ رہا تھا کہ یہ اس کا اپنا قلم ہے۔" معاملہ

کلاس ٹیچر کے پاس پہنچا۔ کلاس ٹیچر لڑکوں کو بلا بلا کر پوچھ رہا تھا۔ ادھر تو یہ ہو رہا تھا۔ ادھر انٹرول کی گھنٹی بجی۔ لڑکے باہر گئے اور پھر ہم نے دیکھا کہ وہ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ مسلم طلبہ ایک طرف اور ہندو ایک طرف۔ اور پھر ہمیں خبر ملی کہ طلبہ میں عنقریب فساد ہونے والا ہے۔ مسلمان طلبہ قادر کے طرفدار ہیں اور ہندو رمیش کے۔"

یہ خبر پا کر میں نے انٹرول ختم ہونے کی گھنٹی قبل از وقت بجوادی اور قلم کی تفتیش اپنے ذمہ لے لی۔ قادر اور رمیش کو بلا کر میں نے دفتر میں بٹھالیا اور اساتذہ سے کہہ دیا کہ نظم اور ڈسپلن میں ذرا بھی ڈھیل سے کام نہ لیں۔ میں تو اسے پرمیشور کی کرپا سمجھتا ہوں میں سوچ ہی رہا تھا کہ رمیش کی زبان سے نکلا "رشاد میاں سے پوچھ لیجیے۔" میں نے رشاد کو اس کے کلاس سے طلب کیا تو معلوم ہوا کہ وہ نماز کے لیے مسجد گیا ہوا ہے۔ وہ روزانہ انٹرول میں نماز پڑھنے مسجد چلا جاتا ہے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آج کچھ مسلمان لڑکے مسجد گئے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ لڑکے قادر کی طرف سے کنویسنگ کرنے گئے ہیں نہ کہ نماز کی غرض سے۔

رشاد کے آنے کے بعد قلم کی کہانی جس پس منظر کے ساتھ سامنے آئی۔ میں چاہتا ہوں، آپ کے سامنے لے آؤں کیونکہ یہی اس واقعہ کی جان ہے اور اس کی تمہید ہمارے اسکول میں نہیں بلکہ اس گھر میں شروع ہوئی جس کے قوام حوالدار صاحب ہیں۔ میں نے رشاد سے ایک ایک بات پوچھی جسے ترتیب دینے کے بعد واقعہ کی نوعیت اس طرح سامنے آئی۔

یہ تو میں عرض ہی کر چکا کہ مسلمان لڑکے قادر کے طرفدار تھے اور ہندو طلبا رمیش کے حامی۔ جو لڑکے رشاد کے ساتھ مسجد گئے تھے انہوں نے نماز تو نہیں پڑھی لیکن رشاد کو پٹی پڑھلانے لگے کہ دیکھو تم بھی ہماری جیسی کہنا۔ رشاد نے پوچھا کیوں؟ اس سے کہا گیا "کیونکہ تم بھی مسلمان ہو اور قادر بھی مسلمان ہے۔ مسلمان کو مسلمان کی طرفداری کرنا چاہیے۔ تم دیکھتے نہیں کہ ہندو لڑکے سب رمیش کے طرفدار ہو گئے۔"

"لیکن میں تو جانتا ہوں کہ قلم رمیش ہی کا ہے اور قادر نے چرا لیا ہے۔ یہ رشاد کا

جواب تھا۔

"تو کیا تم کو اسلام کی لاج نہیں ہے" مسلم لڑکوں نے پھر رشاد کو بہکانے کی کوشش کی۔

"ہے کیوں نہیں؟"

"تو پھر اسلام کی سی کہنا" لڑکوں نے خوش ہو کر مطالبہ کیا۔

خدا نے چاہا تو میں اسلام کے خلاف ایک لفظ بھی نہ کہوں گا لیکن میں تم سب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم اسلام کے بارے میں کچھ سمجھتے بھی ہو۔ یعنی کیا تم یہ جانتے ہو کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔" رشاد نے سوال کیا۔

سمجھتے کیوں نہیں۔ مسلمان وہ ہے جو مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو" لڑکوں نے بڑے فخر کے ساتھ کہا۔ لیکن رشاد نے انہیں بتایا کہ نہیں، مسلمان وہ ہے جو اللہ کو مانے، اللہ کے رسول کو مانے اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور اللہ اور رسول کی ہدایات کے مطابق اپنی زندگی سنوارے۔ سنو، میں تم کو بتاتا ہوں کہ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ شخص ہم میں سے نہیں جو کسی کی بے جا طرفداری کر کے دوسروں سے لڑے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جھوٹی گواہی دینا اور شرک کرنا دونوں برابر کے گناہ ہیں۔"

رشاد سے یہ سنا تو ان لڑکوں کے چہرے پیلے پڑ گئے۔ سب نے مسجد ہی میں رشاد کے سامنے توبہ کی اور اقرار کیا کہ وہ قادر کی حمایت نہیں کریں گے۔ یہ رپورٹ انہی لڑکوں میں سے شکیل نے مجھے سنائی تھی۔ اس کے بعد جب رشاد دفتر میں آیا تو اس نے مجھ سے کہا۔

"میں قادر سے دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے اجازت دے دی۔ رشاد قادر کو ایک طرف لے گیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جس طرح رشاد نے مسجد میں لڑکوں کو سمجھایا تھا، اسی طرح اس نے قادر کو سمجھایا۔ رشاد کے سمجھانے کے بعد قادر جب میرے سامنے آ کر کھڑا ہوا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے روتے ہوئے اقرار کیا کہ شیطان نے اسے بہکا دیا تھا۔ دراصل قلم رئیس ہی کا ہے اور چوری کی سزا بھگتنے کے لیے میں تیار ہوں۔"

قادر کا یہ کہنا تھا کہ میں نے بڑھ کر اُسے گلے سے لگالیا۔ پھر میں نے میز پر رکھا ہوا قلم اٹھا کر رمیش کو دینا چاہا لیکن رمیش اس کی سچائی سے اتنا متاثر ہو گیا تھا کہ اس نے قلم قادر کی طرف بڑھا دیا اور اُس نے بھی اُسے گلے سے لگالیا۔ اب قادر قلم لے نہیں رہا تھا لیکن میرے اشارے سے اُس نے لے لیا پھر میں نے اپنا بہترین فاؤنٹین پن بھی انعام میں اُسے دے دیا۔

یہ ہے واقعہ۔ اگر رشاد بھی فرقہ پرستی کا شکار ہو گیا ہوتا تو فساد کے پھوٹ پڑنے میں دیر نہ تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ کچھ سیاسی پارٹیاں اور فرقہ پرست دوڑ بھاگ کر رہے تھے لیکن جب میں نے دفتر سے نکل کر اسٹاف اور طلبہ کے سامنے صورتِ حال رکھی تو سب بہت خوش ہوئے اور فرقہ پرستوں کی اسکیم خاک میں مل گئی۔

چونکہ اس واقعہ میں اصل کردار رشاد کا تھا۔ اس لیے ہمارے یہاں یہ طے پایا کہ اس واقعہ کو منظرِ عام پر لے آنا چاہیئے۔ اخباروں میں دینا چاہیئے۔ جلوس کی شکل میں اس کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے یہ کام ترپاٹھی جی کے سپرد کیا۔ انہوں نے اردو ہندی میں کہانی کے طور پر اور کمال صاحب نے مکالمہ کے طور پر واقعہ کو اسی ترتیب سے لکھ ڈالا جس ترتیب سے میں نے بیان کیا۔ کہانی کا پس منظر جاننے کے لیے جب میں نے رشاد سے پوچھا کہ تم نے لڑکوں کو کیا اور کیسے سمجھایا تو وہ شرما گیا اور اس نے کچھ نہیں بتایا۔ مجھے یہ ساری معلومات لڑکوں سے حاصل ہوئیں۔ اب میں پھر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ بھگوان نے آپ کو ایسا سپوت عطا فرمایا اور آپ نے اس کی بڑی اچھی طرح تربیت کی اور ایسی تعلیم دے کر ہمارے اسکول میں بھیجا جس کے متعلق میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر اُسے پھیلنے کا موقع ملے تو دنیا سے فسادات مٹ سکتے ہیں۔ کیا میں امید کروں کہ آپ اسلام، اس کے مطالب اور مطالبات سے متعلق کوئی ایسی کتاب بغرض مطالعہ عنایت فرمائیں گے جس سے میں اسلام کے بارے میں پوری پوری واقفیت حاصل کر سکوں۔ میں آپ سے یہ عرض کر دوں کہ میری ابتدائی تعلیم

اُردو ہی میں ہوئی اس لیے میں مشکل سے مشکل کتاب بھی بآسانی سمجھ لوں گا۔"

"الحمدللہ" ضمیر صاحب اور حولدار صاحب کی زبان سے ایک ساتھ نکلا۔ پوری بات سامنے آچکی تھی۔ سکینہ جی نے اجازت چاہی۔ لیکن اسی وقت رشاد کمرے میں آیا۔ اور ضمیر صاحب کے کان میں کچھ کہا اور پھر چلا گیا۔

"چاء آرہی ہے۔ چند منٹ اور تشریف رکھیں۔" ضمیر صاحب نے سکینہ بابو سے درخواست کی جسے انہوں نے بخوشی منظور کرلیا۔ تھوڑی ہی دیر میں رشاد چاء لے آیا۔ ساتھ ہی کچھ موسمی پھل اور بسکٹ بھی تھے سکینہ بابو نے کہا "اس وقت چاء ہی کافی تھی" لیکن رشاد نے ضد کرکے اور ضمیر صاحب اور حولدار صاحب نے تواضع کے طور پر بار بار کہا تو سکینہ بابو کو پورے طور پر چاء نوشی میں شریک ہونا پڑا۔ دیگر اساتذہ نے بھی پھل کھائے اور چاء بھی پی۔ چاء پینے کے بعد سکینہ بابو نے اجازت چاہی اور یہ کہتے ہوئے اپنے اسٹاف کیساتھ رخصت ہوئے کہ آج رات ہمارے اسکول میں کمال صاحب کا تیار کیا ہوا مکالمہ ڈرامے کے طور پر ہوگا۔ آپ دونوں صاحبان کا تشریف لانا ہم سب کے لیے عزت افزائی کا باعث ہوگا۔

للّٰا ؟

"کیا بات ہے، ڈیڑھ مہینہ ہو گیا۔ ابھی وہاں سے جواب نہیں آیا میں روز تم سے پوچھتی ہوں اور تم انکار میں سر ہلا دیتے ہو۔ کیا پتہ تو غلط نہیں لکھ دیا تھا؟"

کانتا نے ٹھاکر کو گھر کے اندر قدم رکھتے دیکھ کر پوچھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ ٹھاکر نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک لفافہ نکالا۔

آ گیا جواب آشا کی ماں! میں نے پتہ غلط نہیں لکھا تھا۔ ایک بات تم کو بتانا بھول گیا تھا۔ میں جیل ہی میں تھا کہ ان کا تبادلہ ہو گیا تھا۔ میرا خط نہ جانے کہاں کہاں کی سیر کرتا ہوا انہیں ملا۔ یہ بات انہوں نے اپنے خط میں لکھی ہے۔ انہوں نے خط کے جواب میں اپنی پوری داستان لکھ دی ہے۔ ان کی داستان تو پھر سننا۔ اس وقت تو تم ان کے مشورے سن لو، جو انہوں نے ہمیں دیے ہیں۔ خاص طور سے للّٰا کے بارے میں کیونکہ اس کا مسئلہ ہی ہمارے لیے سب سے زیادہ اُلجھا ہوا مسئلہ ہے۔ انہوں نے لکھا کہ للّٰا کے دل میں علم کا شوق پیدا

کر کے کسی طرح شانتی نکیتن کلکتہ بھیج دو۔ شانتی نکیتن میں اس وقت ان کے ایک دوست ڈاکٹر احمد صاحب ہیں۔ لڑکے کو انہی کی نگرانی میں وہیں تعلیم دلانا چاہیئے۔ ڈاکٹر صاحب نہایت سنجیدہ آدمی ہیں۔ ان کو اپنی ساری نزاکتیں سمجھا دینا چاہیئے۔ وہ سب کچھ سمجھنے کے بعد للاؔ کو پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنی سرپرستی میں لے لیں گے۔

خط کے جواب میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگر للاؔ کی تعلیم کے بارے میں یہی مشورہ پسند ہو تو فوراً جواب دو تاکہ ڈاکٹر صاحب کو ایک سفارشی خط پہلے سے لکھ دیا جائے اور وہ پہلے سے سارے پہلوؤں پر غور کر لیں۔ شاید اس سلسلے میں وہ کوئی مزید مشورہ دے سکیں۔ اب بتاؤ تم للاؔ کی ماں ہو۔ اس کی جدائی گوارا کر لو گی؟"

"جدائی؟ اس کی جدائی تو مقدر میں لکھی ہے!"

"وہ کیسے؟"

یاد نہیں تم نے بتایا تھا کہ اگر ہم مسلمان ہو گئے تو ہمارے ملک کے قانون کے مطابق ہماری نابالغ اولاد پرانے مذہب میں ہی رہے گی جب تک کہ بالغ ہو کر وہ خود دھرم بدلنے کا اعلان نہ کرے تو اس کے بدلے یہ جدائی اچھی ہے جس میں وہ انسان بنے مگر ایک بات تو بتاؤ۔ وہاں خرچ کتنا ہوگا؟ اور ہم وہاں کا خرچ برداشت بھی کر سکیں گے۔"

"ہاں اس کے بارے میں بھی لکھا ہے کہ اس کی فکر نہ کرنا۔ ڈاکٹر صاحب ایسے گئے گذرے نہیں کہ ایک بچے کو اپنی ذمہ داری اور سرپرستی میں نہ لے سکیں۔ خود کھائیں اور وہ بھوکا رہے۔ وہ خود اس کا بوجھ اٹھا لیں گے۔ مطلب یہ کہ اس سلسلے میں ہمیں فکر اور چنتا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم کہو تو میں چوکیدار سے کہہ دوں کہ ایک ہفتہ کے لیے کلکتہ جا رہا ہوں اور گاؤں والوں کو بتا دوں کہ للاؔ شانتی نکیتن میں پڑھے گا۔"

"لوگ سن کر بڑا تعجب کریں گے۔"

"ہاں تعجب تو کریں گے۔"

"اس کے بعد خدا تم کو وہ آزادی دے کر یہ سپاہی پیادے اور تلنگے روز روز تمہاری راتوں کی نیندیں حرام نہ کریں تو پھر زمین بیچ کر ہم وہیں جا رہے ہیں جہاں تمہارے ایسے چاہنے والے موجود ہیں۔ جن کو تمہارے ساتھ ساتھ تمہاری اولاد کا بھی غم ہے۔"

"یہ سب اس خدا کی مہربانی ہے جس نے ہمیں پیدا کیا اور اس نے ہمیں سیدھے راستے پر لگایا۔"

"اچھا تو آج للاّ سے بات کرو گے نا!"

"ہاں سوچتا ہوں کہ اُسے سمجھاؤں۔"

"تم نے تو ایسی چھوٹ دے رکھی ہے جیسے تم اس کے باپ ہی نہیں۔ کبھی تو اس سے پیار کے ساتھ بات کی ہوتی۔"

"آج دیکھنا، سارا پیار اس پر انڈیل دوں گا۔"

میاں بیوی میں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ آشا بھی مشورے میں شریک تھی حالانکہ وہ کچھ بولی نہ تھی لیکن بڑے غور سے سُن رہی تھی۔ کبھی کبھی بے خیالی میں اس کی زبان سے یہ تو ضرور نکل گیا۔ "کیسے اچھے ہیں وہ لوگ!" اس کے سوا اس نے کچھ نہ کہا بس بیٹھی ہی رہی۔ اتنے میں للاّ کسی ضرورت سے گھر آیا۔ ایک کونے میں اس کا "گلی ڈنڈا" رکھا تھا۔ اس نے لپک کر اٹھایا اور باہر جانے کے لیے پلٹ پڑا۔ اسی وقت باپ نے پکارا۔"

"للاّ پیارے!"

للاّ پیارے" یہ الفاظ اس نے کبھی کاہے کو سنے تھے۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدم یک دم رُک گئے۔ وہ باپ کی طرف دیکھنے لگا۔

"آؤ بیٹا! ہمارے پاس آؤ۔"

للاّ اس طرح باپ کو دیکھنے لگا۔ جیسے اُسے آج پہلی بار یہ یقین آیا ہو کہ دنیا میں اس کا باپ بھی ہے وہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ گلی ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔

آؤ میرے پیارے بیٹے! تمہارے پاس جوتے نہیں ہیں جوتے پہنوگے نا!"

للاّ کو یاد آگیا۔ ایک دن اس نے باپ سے کہا تھا کہ راجن بابو کے لونڈوں لونڈیوں کے پاس بڑے اچھے جوتے ہیں ویسے ہی منگا دیجئے۔ اُس دن تو للاّ پر ڈانٹ پڑگئی تھی۔ آج باپ کی زبان سے سُنا تو اس کے قدم آپ سے آپ باپ کی طرف بڑھنے لگے۔ پاس پہنچا تو باپ نے بڑی محبت سے بٹھالیا۔ اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ تھپتھپانے لگا۔ اس برتاؤ سے للاّ کو ایسا آنند ملا جسے وہ اب تک کی بارہ تیرہ برس کی زندگی میں نہ پاسکا تھا۔

باپ نے اس سے پوچھا۔

"بیٹا! کچھ پڑھو لکھو گے نہیں؟"

"نہ، میں پڑھوں گا نہیں۔"

"کیوں بیٹا؟"

"پڑھنے لکھنے سے آدمی بڑا خراب بنتا ہے۔"

"خراب؟ یہ کیسے تم نے کہہ دیا۔"

راجن بابو کو دیکھو نا! رمیش بھیاّ کو دیکھ لو نا! یہ دونوں ہمارے گاؤں میں سب سے زیادہ پڑھے ہیں۔ ارجن بابو تو اتنا پڑھے ہیں کہ ممبر صاحب ہو گئے۔ دلّی تک جاتے ہیں دُلارے کہتا تھا۔ وہاں وہ اتنی اونچی کوٹھی میں رہتے ہیں۔ دھرم شالے سے بڑی جگہ ہے وہ۔ انہی راجن بابو نے اُس دن گجو دھر کو ایسا مارا تھا ایسا مارا تھا کہ دُکھیا ادھ مرا ہوگیا اور پھر سامان لدوا کر اسٹیشن لے گئے۔ تو کیسے خراب ہیں راجن بابو۔ اور رمیش بھیاّ بی اے پاس ہیں۔ کیداری کہتا تھا رمیش بھیاّ غریبوں کا خون چوستا ہے۔ بڑا بے دھرم ہے وہ۔ تو بابو جی! میں ایسا نہ بنوں گا۔"

للاّ کو ٹھاکر نے بولنے کا موقع دے دیا تھا۔ آج وہ باپ کے سامنے پہلی بار آیا تھا۔ اس نے بھی دل کھول کر اپنی بات کہہ دی۔ ٹھاکر، ٹھکرائن (کانتا) اور آشا سب پوری

توجہ سے اس کی باتیں سنتے رہے۔ للّا چپ ہوا تو ٹھاکر نے کہا۔

تم وہ پڑھائی کیوں نہ پڑھو جس سے ایسے نہیں بنتے بلکہ اچھے بنتے ہیں۔"

"وہ پڑھائی کہاں ہوتی ہے۔"

"اس کے لیے تم کو کلکتے جانا ہوگا۔"

"کلکتے!؟"

کلکتہ کا نام سن کر للّا کی باچھیں کھل گئیں۔ اُس نے سُنا تھا، کلکتہ بہت بڑا شہر ہے اور وہاں سمندر ہے، سمندر میں جہاز چلتے ہیں۔ للّا کو جہاز دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے پھر کہا۔

"کلکتے!؟ ہاں میں وہاں جاؤں گا۔ کتنی دور ہے کلکتہ؟"

"ریل پر جانا ہوگا۔" اُسے بتایا گیا۔ وہ اور زیادہ خوش ہوا۔ اس کو ریل پر سوار ہونے کا بڑا شوق تھا مگر اس نے ریل اب تک دیکھی بھی نہ تھی۔

"میں کلکتہ ضرور جاؤں گا۔"

"پھر تم گھر کو یاد کر کے روؤ گے تو نہیں؟"

"گھر یاد آئے گا تو بھاگ آؤں گا۔"

"بھاگ آؤ گے!" ٹھاکر مسکرا دیئے۔ پھر کہنے لگے "تو پھر پڑھو گے کیسے؟"

"تو کیا وہاں چھٹیاں نہیں ہوتیں؟"

"اچھا چھٹیوں میں آؤ گے! یہ ہے تمہارا مطلب؟ تو جی لگا کر پڑھو گے وہاں۔"

"خوب جی لگا کر پڑھوں گا۔ تم دیکھنا۔"

"اچھا تو کب چلو گے۔"

"جب تم کہو۔"

"اچھا تو تیار ہو۔ تمہارے کچھ جوڑے کپڑے تو بنوا دوں۔ تمہارے لیے جوتا لا دوں۔ ٹوپی بھی تو اچھی سی ہونا چاہیئے اور کتابوں کے لیے بستہ بھی۔"

ٹھاکر سامانِ ضروری کی تفصیل گنا رہے تھے اور للّا سُن سُن کر خوش ہو رہا تھا۔ وہ اتنا خوش تھا کہ اُسے اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا گیا اس نے ایک نظر گلی ڈنڈے پر ڈالی۔ وہ ادھر بڑھا اور اٹھا کر چولھے میں رکھ آیا۔ پھر آ کر بولا "اب میں یہ نہیں کھیلوں گا۔"

ٹھاکر اور ان کے گھر کے لوگ خدا کی اس مہربانی پر بہت خوش ہوئے۔ دل ہی دل میں کہا چلو ایک مرحلہ تو طے ہوا۔ آگے اللہ مالک ہے۔

اقدام

بیوی سے گفتگو کرنے کے بعد مرشد علی خاں صاحب نے بار بار بیٹے کی شادی کے متعلق سوچا۔ انہوں نے جب غور کیا تو بھائی کی بات میں ان کو وزن محسوس ہوا۔ وہ اسی نتیجے پر پہنچے کہ ابھی ارشی کی شادی کے متعلق ضمیر صاحب سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرنی چاہیئے اس وقت پیام نکاح دینے میں اندیشہ ہے کہ وہ انکار کر دیں۔ مانا وہ خوبصورت الفاظ میں یہ کہیں کہ رضیہ ابھی بچی ہے کھیلنے کھانے اور پڑھنے کے دن ہیں لیکن دراصل یہ بھی انکار کی ایک شکل ہے انکار کسی شکل میں ہو پھر اس سے آئندہ کے لیے راستہ بند ہو جائے گا۔ زیادہ اچھا یہی ہے کہ دو تین سال ٹھہر کر پیام رسانی کی جائے۔ اس عرصے میں ارشی کو معنوی حیثیت سے نہ سہی بظاہر ایسا بنانے کی کوشش کریں کہ وہ دیکھنے میں مسلمان ہی معلوم ہو اور جب مسلمانوں کی صحبت میں بیٹھے تو نماز روزہ اور کلمہ وکلام کے متعلق اپنے خیالات کو اسلام کی موافقت ظاہر کر سکے۔ مرشد علی خاں صاحب نے اپنے ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کیلئے

ارشی سے بھی گفتگو کرنا مناسب سمجھی۔ ایک دن انہوں نے بیٹے کو پاس بٹھایا اور اس طرح گفتگو شروع کردی۔

دیکھو بیٹے! اب تم بچہ نہیں ہو۔ ماشاءاللہ تمہاری عمر اب اس قابل ہے کہ اب تمہاری آئندہ زندگی کے لیے میں جو کچھ سوچنا چاہوں تو تم سے بھی مشورہ کرلوں۔ تمہاری آئندہ زندگی کے متعلق مجھے کئی باتوں پر غور کرنا ہے۔ اول تو یہ کہ تمہارا ذریعہ معاش آگے چل کر کیا ہونا چاہیئے۔ اگر تم کو معلم یا کلرک بننا ہے تو آئندہ سال سے تمہیں اسی کے مطابق تعلیم حاصل کرنا ہوگی۔ اگر ڈاکٹر یا انجینیر بننا ہے تو اس کے لیے رہنما مضامین کا انتخاب کرکے آگے بڑھنا ہوگا اور اگر کسی کارخانے یا فرم میں ملازمت کرنے کا ارادہ ہے تو پھر تمہارے لیے بی کام کے درجے ہیں لہٰذا تم مجھے اپنے متعلق یہ بتاؤ کہ تمہیں ان میں سے کس مضمون سے دلچسپی ہے۔ تمہارے رجحانات سامنے آئیں گے تو میں انہی کے مطابق تمہاری آئندہ تعلیم کیلئے سوچوں گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ میں اپنی زندگی ہی میں تم کو ازدواجی زندگی میں لے آنا چاہتا ہوں۔ میرے بعد معلوم نہیں کہ ناتجربہ کاری میں تم کس گھرانے سے رشتہ قائم کر بیٹھو اور وہ تمہارے لیے مضر ثابت ہو۔ آج کل لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ ایک سے ایک اچھی لڑکی مل سکتی ہے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ گھریلو زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے ایسی لڑکی بہت مناسب ہوگی جس نے اسلامی تعلیم بھی حاصل کی ہو۔ وہ پاکی اور ناپاکی کے مسائل سے بھی واقف ہو۔ اپنے شوہر اور اپنے بڑوں کے حقوق کو بھی جانتی ہو نیز اتنا پڑھی لکھی ہو کہ ہماری آج کی سوسائٹی میں فٹ ہو سکے۔ میں تم سے صاف صاف کہدوں حالانکہ میں ابھی کہنا نہیں چاہتا تھا لیکن تمہاری والدہ نے قبل از وقت تم کو وہ بتا دیا جو کم سے کم تین چار سال کے بعد تم کو معلوم ہونا چاہیئے تھا۔ اس وقت تم اپنے متعلق کچھ سوچتے بھی۔ اس وقت جب کہ تم سترہ اٹھارہ برس کے نوجوان ہو بھلا کیا سوچ سکتے ہو۔ یہ تو وہ عمر ہے کہ جب

طرف چلائے، چلدیئے۔ جس دھارے میں پڑ گئے، بہہ گئے۔ خیر تمہاری والدہ یہ سوچ رہی ہیں کہ تمہاری شادی ضمیر صاحب کی لڑکی رضیہ سے کر دیں۔ اگر تم کو یہ رشتہ پسند ہے اور اب تمہاری پسند اور ناپسند ہی کیا، مجھے تو یہ معلوم ہوا ہے کہ تم کو اس رشتے سے اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے کہ تم نے وہاں جاکر اس سے ربط بڑھانے کی کوشش کی۔ آج کل کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مخلوط تعلیم کے تحت غیر شعوری طور پر یہ بھی مدّ نظر ہے کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنا جیون ساتھی چن سکیں۔ لیکن مسلمان ابھی اتنے ترقی یافتہ اور روشن خیال نہیں ہو سکے ہیں۔ کہ اس طرح رشتے کو پسند کریں۔ بہرحال اگر تم رضیہ کو پسند کرتے ہو تو تم کو اس کا شوہر بننے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرنا ہوگی۔ نہ سہی باطنی وہ اصلاح جس کو ضمیر صاحب پسند کریں۔ کم سے کم ظاہر میں تو ویسے بن ہی جانا چاہیئے۔ جو وہ لوگ چاہتے ہیں۔ اب تم اپنی جگہ غور کرلو۔ تمہارے جیسے رجحانات میں پاؤں گا۔ انہی کے مطابق اپنی جدوجہد شروع کر دوں گا۔ میں پھر یہ کہہ دوں کہ تمہارے جیسے نوجوان سے یہ باتیں میں نے قبل از وقت کرلیں۔ میں تمہاری والدہ سے مجبور ہو گیا۔ تمہاری والدہ سے مشورہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شادی تو چاہے چار چھ برس کے بعد ہو لیکن طے ابھی ہو جانا چاہیئے۔ تمہاری ماں کو اندیشہ ہے کہ کہیں دوسری جگہ رضیہ کی منگنی ہو جائے تو ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں۔ اب جاؤ تم وہ کچھ بننے کی کوشش کرو جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اور میں امروز فردا میں بریلی جاتا ہوں۔ راشد سے کہہ کر ضمیر صاحب کو راضی کرنا ہے۔"

مرشد علی خاں صاحب نے بیٹے کے سامنے صاف صاف گفتگو کی تو رہا سہا وہ حجاب بھی درمیان سے اٹھ گیا جس کی وجہ سے بیٹا کھل کر ان کے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کر سکتا تھا جو مغربی تہذیب میں خواہ مستحسن ہو لیکن مشرقی تہذیب میں معیوب ہی سمجھی جاتی ہے بیٹے نے باپ سے کہا:۔

اباجان! میں نے سنا ہے کہ ضمیر صاحب رضیہ کی شادی رشاد سے کرنا چاہتے

ہیں اور راشد چچا بھی یہی پسند کرتے ہیں۔ راشد چچا نے اسی بغض کی وجہ سے مجھے دو دن بھی بریلی میں رہنے نہیں دیا اور مجھے واپس کر دیا۔"

تو بیٹے! تم کو یہ بھی معلوم ہو گیا اور شاید یہ بھی تمہاری والدہ محترمہ نے ہی تم کو بتایا ہو گا۔ ماشاء اللہ بڑی اچھی تربیت کر رہی ہیں تمہاری والدہ۔ وہ قبل از وقت تم کو اس فن میں طاق کر دیں گی۔"

مرشد علی خاں نے طنز و طعن کے ساتھ یہ جملے کہے۔ ارشی ان کا یہ رُخ دیکھ کر کھسک گیا اور جا کر ماں سے سارا حال کہا۔ "کم بخت! تو نے باپ سے یہ کیوں بتا دیا۔" رئیسہ سلطانہ جھنجھلا کر اٹھی۔ میاں کے پاس پہنچی۔ دیکھا تو میاں کے چہرے پر ایک رنگ آتا ہے ایک جاتا ہے۔

"کتنی دیر سے تم نے پان نہیں کھایا ہے۔ اگر میں بھول جاؤں تو کیا تم مانگ بھی نہیں سکتے۔ اب مجھے یاد آیا تو لے کر دوڑی آئی۔"

اور یہ کہہ کر میاں کی طرف پانوں سے بھری ڈبیہ بڑھا دی مرشد علی خاں نے پان منہ میں لیا۔

"اس وقت اچھا ہوا تم چلی آئیں۔ مجھے تم سے کچھ کہنا بھی ہے۔"

"میں حاضر ہوں۔ جو کچھ میری سمجھ میں آئے گا۔ عرض کروں گی۔"

تم نے ارشی کو یہ بتا کر اچھا نہیں کیا کہ راشد رضیہ کو اپنی بہو بنانا چاہتا ہے۔ اس کا نفسیاتی اثر ارشی پر بھی پڑ سکتا ہے کہ اس نو عمری ہی میں رشاد کی جانب سے اس کے دل میں رقابت پیدا ہو جائے اور نا تجربہ کاری میں اس سے خدا جانے کیسی حرکت سرزد ہو جائے اگر خدانخواستہ ارشی رشاد کو اپنی راہ کا روڑا سمجھ کر اُسے ہٹانے کی کوشش شروع کر دے گا تو میں تم کو بتانا چاہتا ہوں کہ رقابت کی آگ جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ اگر ارشی اس حماقت میں مبتلا ہو گیا تو میں جس محکمے میں رہ چکا ہوں اس میں بے شمار ایسے تجربات

سامنے آئے ہیں اور ان سب کا انجام بھی میرے سامنے ہے۔ مرتکب دین و دنیا دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔"

رئیسہ سلطانہ ریٹائرڈ انسپکٹر کی باتیں سنتی رہی اور دل ہی دل میں سوچتی رہی کہ شوہر کا مزاج کس طرح اعتدال پر لائے۔ رئیسہ سلطانہ نفسیات کی وہ بات جو انسپکٹر صاحب اسے سمجھا رہے تھے، کچھ یونہی سمجھی۔ وہ یہ غور کر رہی تھی کہ میاں کے دل سے اس کی اہمیت کس طرح کم کرے کہ ارشی کو رشاد رضیہ کے رشتے کی وہ بات معلوم ہو چکی ہے جو بریلی والوں کے تو ذہن میں بھی نہیں آئی اور اتنی دور لکھنؤ کے چند افراد کو معلوم ہو گئی۔ اس نے کہا۔

میں نفسیات کو کیا جانوں کہ وہ کیا بلا ہوتی ہے۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ بچوں کو نشیب و فراز سے واقف رکھنا چاہیئے۔ تم یہ بھی تو سوچو کہ ہم تم تو رضیہ کے لیے کوشش کرتے اور ارشی کہیں اور دل دے بیٹھتا تو کیسی سخت گرہ پڑتی۔

ریٹائرڈ انسپکٹر پولیس جناب مرشد علی خاں نے نہ جانے کیسے کیسے بدمعاشوں اور مکاروں کو انگلیوں پر نچایا تھا۔ ان کے جوڑ توڑ کس کس طرح ناکام بنائے تھے لیکن آج ایک عورت سے یہ سنا تو ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ وہ بیوی کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ بولی:۔

تم کچھ پریشان سے نظر آ رہے ہو۔ چائے لاؤں۔" اور وہ چائے کے بہانے سامنے سے ذرا دیر کے لیے ہٹ گئی۔ سمجھ تو گئی کہ انسپکٹر صاحب کی نفسیات سب دھری کی دھری رہ گئی لیکن پھر بھی اس نے کچھ دیر تنہا سوچنے کے لیے چھوڑ دیا۔ وہ گئی۔ اس نے پانی گرم کیا اور پھر ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔ چائے بنا کر میاں کے سامنے پیش کی۔ چائے پی کر انسپکٹر صاحب نے بیوی سے کہا:۔

تو میرا ارادہ ہے کہ اتوار کو بریلی جاؤں اور وہ جو تم نے مشورہ دیا ہے کہ فی الحال ضمیر صاحب رشتہ منظور کر لیں، راشد کے ذریعہ کوشش کروں۔ اب تم یہ کرو کہ ارشی کو کبھی کبھی

مولانا ہلالی صاحب کے پاس بھیج دیا کرو۔ ان کی صحبت میں وہ بہت کچھ اسلامیات سیکھ لے گا۔ کم سے کم اتنا تو بنانا ہی ہے کہ اگر ضمیر صاحب اس سے بات کریں تو وہ اسلام سے اپنی دلچسپی کا اظہار تو کر ہی سکے۔ کسی طرح اللہ تعالیٰ اس نیک کام سے ہمیں "نجات" دے۔"

"نجات!" بیوی چونک پڑی۔ تم تو بڑی دور کے لفظ بولنے لگے۔ ہمارے لکھنؤ میں تو ایسے موقع پر "فارغ" "عہدہ برآ" اور "سبکدوش" کے مثل الفاظ استعمال کرتے ہیں"۔

اور میں کسی گاؤں سے پکڑ لایا گیا ہوں۔ تم نے معاملہ جس قدر پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اگر میں اسے سلجھا لے گیا تو میں اسے "نجات" سے ہی تعبیر کروں گا۔"

ارے توبہ! تم نے میری بات سے یہ نتیجہ کیوں نکال لیا کہ میں تم کو گنوار سمجھنے لگی۔ میں نے تو یہ طے کیا کہ بہت دور کا لفظ بولے تم۔ تو واقعی جس معاملے کو میں نے الجھا دیا ہے اسے سلجھانے کے بعد ہی سمجھنا چاہیئے کہ اس سے نجات ملی۔ چلو بس ہو گیا۔ اب وہ سوچو جو دل میں ہے۔ لفظوں کے استعمال میں کیا دھرا ہے۔ کام بننا چاہیئے۔ تو اتوار کو بریلی جاؤ گے نا!"

ہاں سوچتا تو یہی ہوں۔ تم رشاد اور ننھی کے لیے کچھ تجویز کرلو۔ پہلے جب ہم تم گئے تھے تو یہ سخت غلطی کی تھی کہ بس دس پانچ روپوں کے پھل اور رس گلے لے گئے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک شیروانی رشاد کے لیے اور ایک اچھا سا فراک اور کان کی بالیاں ننھی کیلئے لیتا جاؤں۔ کیا رائے ہے؟"

کیا کہنا۔ بہت خوب تم نے سوچا۔ اچھا تو بازار جاؤ۔ یہ سب خرید کرلو۔ مجھے بھی دکھا لینا۔ فراک کا کپڑا تو گھر ہی لیتے آنا۔ میں خود بناؤں گی۔ ایک تولہ تار بھی لیتے آیئے گا۔"

"اور کیا رائے ہے۔ رضیہ کے لیے کچھ لے جانا چاہیئے یا نہیں؟"

"معاملہ کچھ نازک سا ہے۔ میرے خیال میں دو طرح کی بالیاں لیتے جاؤ۔

ایک بڑی دوسری چھوٹی۔ ننھی کی ماں سے بات یہ بنانا کہ ننھی کی پسند کے لیے دو طرح کی لایا ہوں۔ پھر وہاں جیسا رُخ دیکھنا کرنا۔ اگر مناسب سمجھنا تو رضیہ کو دے دینا۔ ورنہ مریم ہی کو دے دینا۔ کچھ تو دباؤ اس پر بھی پڑنا چاہیئے۔"

"ہاں یہ ترکیب ٹھیک ہے۔"

"تو پھر جاؤ بازار!"

"خالی ہاتھ ہی چلا جاؤں؟"

"کتنے لا دوں؟"

"کم سے کم چار سو تو لا ہی دو۔"

"لو۔ ابھی لائی۔ ذرا میرے ہاتھ سے ایک پان تو کھالو تم۔"

"اونہہ، ابھی یہ چونچلے تمہارے دل میں کروٹیں لے رہے ہیں۔"

"نہیں میری خوشی یہی ہے۔"

"اچھا لاؤ۔"

"لو۔"

"شکریہ!"

کلکتہ سے واپسی

کئی دن سفر میں رہنے کے بعد جیسے ہی ٹھاکر نے گھر میں قدم رکھا۔ کانتا اور آشا نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ معمولی ناشتہ کرا کے اور رسمی خیریت اور خیر صلاّ کے بعد کانتا نے شوہر کو آرام کرنے کیلئے لیٹ جانے کو کہا۔ ٹھاکر نے سامان بیوی کے حوالے کیا اور پھر جو سوئے تو دو بجے کروٹ لی۔ بیوی اور بیٹی (کانتا اور آشا) تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کمرے میں آ آ کر دیکھ جاتی تھیں۔ دو بجے جیسے ہی ٹھاکر کی آنکھ کھلی۔ کانتا کو سامنے کھڑے پایا "خیریت تو ہے؟"

"ہاں، تم کو دیکھنے آئی تھی۔ اب اٹھو۔ سو لیے خوب نا!"

"ہاں، خوب سویا۔ سفر میں سونا کہاں نصیب ہوتا ہے اور پھر اتنا لمبا سفر" ٹھاکر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ کانتا نے آشا کو پکارا "بیٹی پانی گرم ہے نا!" یہ سن کر آشا نے جھٹ باپ کے نہانے کا انتظام کر دیا۔ ٹھاکر نے اٹھ کر غسل کیا۔ کھانا تو پہلے ہی تیار ہو چکا تھا۔ غسل کر کے

وہ کھانا کھانے لگے۔ وہ کھانا کھاتے جاتے تھے اور سفر کی باتیں کرتے جاتے تھے۔

"تو للّا رک جائے گا کلکتہ میں؟" بیوی نے پوچھا۔

ہاں یقین تو ہے۔ میں جیسے ہی شانتی نکیتن پہنچا۔ لوگوں سے پوچھ کر ڈاکٹر احمد صاحب سے ملا تو ان کا چہرہ ہی دیکھ کر بھانپ لیا کہ وہ نہایت شریف آدمی ہیں۔ وہ بھی بڑے تپاک سے ملے۔ سنّے کو ساتھ دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ آنے والا کون ہو سکتا ہے۔"

"ان کے پاس تمہارے محسن کا خط پہنچ چکا ہوگا اسی سے تو جانا ہوگا نا!"

"ہاں، ڈاکٹر صاحب کئی دن سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ تین دن میں ان کا مہمان رہا۔ ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے ڈاکٹر صاحب میرے پرانے لنگوٹیا یار ہوں۔ اتنے بڑے عہدہ پر ہیں ڈیڑھ ہزار تنخواہ ہے۔ لیکن مجھ سے اس طرح ملے جیسے بڑی پرانی جان پہچان ہو۔ گھر بھر کی خیریت دیر تک پوچھتے رہے۔ میں نے بھی خوب پھیلا کر اپنی آپ بیتی ان کو سنائی۔ میں یہاں جس احتیاط سے کام لے رہا ہوں، اس کا حال سن کر کہنے لگے۔ "ٹھاکر صاحب آپ بہت سمجھدار آدمی ہیں۔" تین دن مجھے اور للّا کو کلکتے کی خوب سیر کرائی۔ للّا کو تو ہر وقت اپنے پاس رکھتے۔ میرے سامنے یہ حال تھا کہ اس پر اپنا وہ سارا پیار انڈیل دیا جو دراصل ایک باپ اپنے بیٹے کے ساتھ کر سکتا ہے۔"

"ارے سنو تو ٹھاکر! تم ان کے بال بچوں کے لیے بھی کچھ تحفے لیتے گئے تھے؟"

لے تو لیا تھا میں نے بہت کچھ۔ پھل میرے ساتھ تھے۔ کئی طرح کی مٹھائیاں راستے میں لے لی تھیں۔ کچھ چھوٹے بچوں کا تصور کر کے چھوٹے بڑے بشرٹ وغیرہ بھی خرید لیے تھے۔ یہ سب لیکر وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب ابھی کنوارے ہی ہیں۔"

"تو وہ اپنی طرف اور تم اپنی جگہ خوب ہی ہنسے ہو گے۔"

"ہاں دل میں بھی مسکرایا اور ان کے ہونٹوں پر بھی معمولی سی ہنسی کھیل سی گئی۔"

"اور ان کی عمر کیا ہے؟"

یہی کوئی تیس بتیس کے ہوں گے ۔ ہیں تو ابھی کم عمر لیکن ان کی قابلیت کی دھوم شانتی نکیتن میں مچی ہے ۔ ہندو مسلمان سب ان کی عزت کرتے ہیں ۔ یہ تم کو میں نے پہلے ہی بتایا تھا کہ شانتی نکیتن میں تعصّب نام کو نہیں، وہاں مسلمان بھی اُسی عزت کے ساتھ رہتا ہے جیسے ہندو رہتے ہیں ۔ میری شکل وصورت ابھی جیسی ہے، سب کے سامنے ہے لیکن جب اپنے ایک دوست سے مجھے ملایا تو یہ کہہ کر ملایا کہ یہ میرے بڑے بھائی ہیں ۔ اس نے میری صورت دیکھی اور نہ جانے کیا دیکھتا رہا ۔ میری بڑی بڑی مونچھیں میری باتیں اور عادتیں تو ظاہر ہے ابھی وہی ہیں جو ہونا چاہیئں ۔ یہ تو چھوٹتے چھوٹتے چھوٹیں گی ۔ ڈاکٹر صاحب کے دوست نے بھانپ تو لیا ہوگا ۔ مگر اس نے شک والی ایک بات بھی تو نہیں کہی ۔ بڑی خوش دلی سے ملا ۔"

"تو للّا اُن سے ہل مل گیا!"

خوب، جب میں وہاں سے چلا تو ڈاکٹر صاحب اُسے لے کر مجھے اسٹیشن تک بھیجنے آئے ۔ میں نے کہا بھی "للّا چلو گے گھر؟" تو اس نے کہا "میں تو یہیں رہوں گا۔" یہ سُنا تو ڈاکٹر صاحب نے اُسے اپنے قریب گھسیٹ لیا ۔ آشا کی ماں! تم بالکل اطمینان رکھو ۔ تمہارے بیٹے کو وہاں وہ آرام اور سُکھ حاصل ہے جو تم یہاں نہیں دے سکتیں اور یہ میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ جب تم ڈاکٹر صاحب کو دیکھو گی تو تم بھی تعریف کرو گی ۔"

"تو کیا وہ کبھی ہمارے یہاں آئیں گے؟"

"یہاں تو نہیں آئیں گے لیکن اب ہم جہاں چل کر بسیں گے وہاں تو آئیں گے ہی ۔ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ بڑی تعطیل میں وہ "بچے" کو لے کر خود آئیں گے ۔"

"جُگ جُگ جیئیں ڈاکٹر صاحب اور ان کے ماں باپ ان کے سر سہرا دیکھیں۔"

ہاں دعا میرے دل سے بھی نکلتی ہے۔ ایسا بھلامانس جوان تو میں نے دیکھا ہی نہیں۔"

"پرماتما نے چاہا تو میں بھی ان کو دیکھوں گی۔"

اور میں بھی اپنے للاّ بھیّا کے اس پریمی کو دیکھوں گی۔" آشا کی زبان سے اچانک نکل گیا۔ ماں باپ دونوں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ شرما گئی۔ ٹھاکر نے کہا۔

اری تو تو اس وقت پردہ کرنے لگے گی۔ مسلمان ہونے کے بعد تجھے پردہ کرنا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کے سامنے تو کیسے ہو سکے گی اور پھر تجھے آتا جاتا کیا ہے۔ یہیں پاٹھ شالہ ہی میں تو تو نے پڑھا ہے اور وہ ہیں کہ عالم فاضل آدمی۔ عربی اردو انگریزی ہندی سب ہی بھاشائیں تو جانتے ہیں۔"

ٹھاکر نے یہ کہا تو آشا شرما گئی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ماں نے کہا۔

"چلو ہٹو ٹھاکر، میری بچی کا دل توڑا نہ کرو۔ ہاں بیٹی تو بھی ڈاکٹر صاحب کو دیکھے گی۔ دیکھ خوب خاطر کرنا۔ اور اب جو دن نصیب ہیں پڑھائی میں دل لگا۔ سنتے ہو تم! اسے اچھی اچھی کتابیں لا کر دو۔"

کانتا کبھی اپنی بیٹی سے کچھ کہتی کبھی دو ایک جملے شوہر سے۔ اس طرح کے ملے جلے وہ کئی جملے بول گئی۔ ٹھاکر نے چپکے سے کہا "خدا وہ دن لائے کہ ہم سب یہاں سے نکل چلیں۔ آشا کو تو قرآن شریف پڑھوانا ہے۔ اور وہ ساری باتیں پڑھوانا ہیں جن کو پڑھ کر ایک مسلمان پورا مسلمان بنتا ہے۔ سنو تو آشا کی ماں! تمہاری کیا رائے ہے؟"

"کس بارے میں؟"

"اچھا لو، کھانا کھا چکا میں۔"

"بیٹی برتن لے جاؤ اور آکر یہیں بیٹھو۔ باپ کی باتیں سنو۔"

نہیں بیٹی! برتن دھو دھلا کر ٹھیک سے رکھ دینا اور تب آنا۔" یہ کہتے

ہوئے ٹھاکر نے بیوی کو آنکھ ماری۔ بیوی نے بھی کچھ سمجھ کر کہا "اچھا ہاں بیٹی! برتن گندے نہ رکھنا۔"

آشا اُدھر برتنوں کو دھونے میں لگ گئی۔ ادھر ٹھاکر نے بیوی سے کہا۔
"آشا کی ماں! جب سے میں نے ڈاکٹر صاحب کو دیکھا ہے۔ وہ مجھے بھولتے نہیں۔"

وہ تو تم کہہ ہی چکے ہو کہ وہ بہت بھلے مانس ہیں اور پھر تمہارے ساتھ انہوں نے اچھا برتاؤ کیا۔ تمہارا بچہ ان کے پاس ہے۔ بھلا وہ بھول کیسے سکتے ہیں۔"

آشا کی ماں! میں جب یہاں سے کلکتے کو چلا تھا تو میں نے اس خدا سے دعا مانگی جس پر ہم تم سب ایمان لا چکے ہیں کہ للّا کے لیے وہاں رہنے کی گنجائش نکل آئے۔ میری وہ دعا تو خدا نے سُن لی پھر جب میں وہاں سے چلا تو میں نے ایک دعا اور مانگی تھی۔

"وہ کیا؟"

میں نے دُعا مانگی کہ اے میرے خدا! تو نے مجھے سیدھا راستہ دکھایا میری بیٹی کے لیے ڈاکٹر صاحب کے دل . . .

. . . ." آشا کو آتے دیکھ کر ٹھاکر چپ کے چپ رہ گئے۔ ان کے دل کی بات دل ہی میں رہ گئی۔ آشا نے اپنا اور ڈاکٹر صاحب کا نام تو سُنا لیکن وہ کچھ سمجھ نہ سکی۔ ہاں بیوی ضرور سمجھ گئی کہ ٹھاکر کے من کی بات کیا ہے۔ آشا آئی تو دیر تک کمرے میں سب گم سم ہی بیٹھے رہے۔ آشا کو تعجب ہوا۔ اس نے کہا۔

"بابوجی! تم میرے بارے میں کیا کہہ رہے تھے۔ تم نے ڈاکٹر صاحب کا نام بھی لیا تھا۔"

"کچھ نہیں بیٹی! وہ پوچھ رہے تھے کہ للّا کے اور بھائی بہن کون کون ہیں۔ وہی میں بتا رہا تھا کہ گھر میں صرف آشا ہے۔"

"تو ڈاکٹر صاحب نے کیا کہا؟" آشا نے پوچھا۔

"کہتے کیا۔ تمہارے لیے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ تم کو سچّا اور پکا مومن بنائے۔"

"سچّا اور پکا مومن!" آشا نے یہ لفظ اپنی زبان سے دُہرائے خدا نے چاہا تو میں سچی اور پکی مسلمان بن کر دکھا دوں گی۔"

"شاباش بیٹی شاباش! خدا تجھے خوش رکھے۔"

"اچھا، وہاں کی باتیں تو ہو چکیں اب یہاں کی سوچو۔ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔"

"کرنا کیا ہے۔" کانتا کہنے لگی۔ "اب کرنا کیا ہے۔ زمین مکھیا نے لے ہی لی۔ روپیہ تم بینک میں جمع کر آئے۔ یہ تم نے بڑا اچھا کیا۔ اگر روپیہ یہاں لاتے تو ہمیں اس کیلئے بڑی پریشانی رہتی۔ ڈاکٹر صاحب نے سچ ہی کہا کہ تم بڑے سمجھ دار ہو۔"

"پھر وہی ڈاکٹر صاحب۔" ٹھاکر نے کہا اور وہ مسکرا دیئے۔ ان کے ساتھ آشا بھی مسکرانے لگی۔ کانتا کہہ رہی تھی "اب بڑا بڑا سامان اونے پونے بیچنا شروع کر دو۔ اور جتنی جلدی ہو یہاں سے نکل چلو۔"

"ایک بات بتاؤ آشا کی ماں؟"

"کیا؟"

"آشا کی جنم پتری تو تمہارے پاس ہوگی!"

"ہاں ہے تو۔ لے آؤں۔"

"ہاں لے آؤ!"

"جنم پتری کیا ہوگی کیا کہیں بر ڈھونڈنے جاؤ گے۔" کانتا کے یہ کہنے سے آشا جھینپ گئی۔ اس نے اپنا پلّو منہ پر ڈال لیا اور سر جھکا لیا۔ کانتا نے جا کر بکس کھولا اور آشا کی جنم پتری نکال لائی۔"

"اسے حفاظت سے رکھنا۔"

"کیوں اس کے بارے میں اتنی تاکید کیوں کر رہے ہو؟"

بتاؤں، کیا بات ہے۔ دراصل مجھے ایک اندیشہ ہے۔ سارے اندیشوں کے دروازے میں نے بند کر دیئے لیکن ایک کھٹکا باقی ہے۔ للاؔ کی طرف سے اطمینان ہے۔ وہ ایسی جگہ ہے کہ کوئی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ ہاں یہاں ڈر یہ ہے کہ جب ہم تم سب اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کریں گے تو فرقہ پرستوں کو بہت کھلے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ آشا کو نابالغ ثابت کرنے کی کوشش کریں اس وقت یہ جنم پتری کام آئے گی۔"

ٹھاکر! تم سچ مچ بڑی دور کی سوچتے ہو۔ لیکن سنو تو۔ ہم یہاں اپنے مسلمان ہونے کا اعلان نہیں کریں گے۔ تم تو کہتے تھے کہ دلّی چل کر جامع مسجد میں اعلان کریں گے اور اسی دن بریلی کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ دوسرے دن ہم سب بریلی تمہارے متر کے گھر پہنچ جائیں گے۔ اگر ایشور نے چاہا۔"

ان شاء اللہ! بیٹی تم بھی کہو ان شاء اللہ" آشا نے ان شاء اللہ کہنے کے ساتھ ہی مطلب پوچھا۔ ٹھاکر نے بتایا اس کا مطلب وہی ہے جو تمہاری ماں نے کہا کہ اگر ایشور نے چاہا۔ بیٹی! خدا کو چاہے جس اچھے نام سے پکارو اور چاہے جس بھاشا میں اس کا نام لو وہ سنتا ہے۔ سمجھیں تم؟

"جی بابوجی۔ اب میں اُسے "اللہ" کہہ کر پکارا کروں گی۔"

"ان شاء اللہ" "ان شاء اللہ"

بادلِ ناخواستہ

بھائی کا آنا اور اس شان سے کہ کم سے کم تین چار سو کے تحفے اور سوغات ساتھ۔ راشد علی خاں چونکے۔ بڑا بھائی لایا تھا۔ لینے سے انکار کیسے کرتے لیکن یہ ضرور خیال آیا کہ اس سے پہلے بھی آئے تھے اور چھ سات برس کے بعد ملاقات ہوئی تھی اس وقت صرف دس بیس روپوں کی مٹھائی اور پھلوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ آج یہ سینکڑوں کے تحفے بلاوجہ نہیں۔

اور حقیقت بھی یہی تھی کہ یہ تحفے بلاوجہ نہیں تھے یہی تو وہ باتیں ہیں جن کے دباؤ میں پڑکر انسان کو وہ کچھ کرنا پڑتا ہے جو کرنا نہیں چاہتا لیکن راشد علی خاں پر بڑے بھائی مرشد علی خاں کے وہ احسانات کیا کم تھے جو انہوں نے باپ بن کر ان پر کیے تھے۔ مزید ایسے دباؤ کی ضرورت ہی کیا تھی۔ چنانچہ جس وقت رشادِ اور نھی کے بڑے ابّا نے انہیں بلا کر یہ سب دیا تو دبی زبان سے راشد علی خاں نے کہا بھی کہ بھائی صاحب اس کی کیا ضرورت

تھی، میں آپ کے احسانات سے ویسے ہی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

"احمق ہو تم! کیا میں یونہی خالی ہاتھ آکر یہاں کھڑا ہو جاتا یہ بچے کیا میرے نہیں ہیں؟"

اس بات کا جواب ہی کیا ہو سکتا تھا۔ راشد علی خاں خاموش ہو گئے۔ دن بھر سوچتے رہے کہ بھائی صاحب کا یہ آنا خالی از علّت نہیں۔ بیوی (مریم) سے کہا بھی "بھائی صاحب نے تم سے کچھ کہا تو نہیں؟" مریم بھی سوچ میں تھی کہ بلا اطلاع ان کا نازل ہونا کوئی معنی رکھتا ہے۔ آخر رات کو وہ کھلے۔ کھانا کھا کر جب دونوں بھائی لیٹنے کو چلے تو حرفِ مطلب زبان سے نکلا۔ مرشد علی خاں نے چھوٹے بھائی کو یوں مخاطب کیا۔

"ارے بھائی، ارشی کی ماں بھی آنے والی تھیں۔ کہتی تھیں کہ رشاد وغیرہ کو دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔"

"تو پھر آپ نے کیوں نہیں ساتھ لے لیا۔ لے آئے ہوتے آپ۔ گھر میں ایک بزرگ کا آنا ہمارے لیے باعث برکت ہی ہوتا۔"

وہ تو ٹھیک ہے بھائی! مگر وہ آتیں تو گھر کا پورا لشکر تیار ہو جاتا اور پھر مجھے ہی تو سارا بار برداشت کرنا ہوتا۔ میں نے کسی نہ کسی طرح انہیں روکا۔

"اچھا تو فرمائیے بچے سب باقاعدہ پڑھ رہے ہیں؟"

"ہاں بھائی! کوشش تو کرتا ہوں۔ ارشی محنت سے پڑھتا ہے۔ اب تو میں نے اُسے دینیات کی طرف بھی متوجہ کر دیا ہے۔ وہ مولانا ہلالی صاحب کے پاس جاتا ہے۔ ما شاء اللہ نماز کا پابند ہو گیا ہے۔"

"الحمد للہ! خدا کرے دوسرے بچے بھی ایسے بنیں!"

"آمین!"

اور سنو تو راشد! تم نے ایک خط کے سوا جتنے خطوط بھیجے ان میں گھر کی

خیریت اور خیر صلاّ کے سوا وہ بات نہ ملی جس کے متعلق میں نے تم سے مشورہ طلب کیا تھا۔"

"کیا بھائی صاحب؟ ذرا یاد دلائیے!"

"ارے بھئی، وہی۔ ارشی کے رشتے کے بارے میں۔"

"اچھا ہاں! یاد آیا۔ میں نے شاید لکھ دیا تھا کہ ابھی یہ بات قبل از وقت ہے۔"

"ہاں، تم نے لکھ تو دیا تھا لیکن تمہاری بھابی یہ چاہتی ہیں کہ عندیہ معلوم ہو جائے۔ اور ہو سکے تو بات "پکی" کر لی جائے۔ شادی جب چاہیں کریں۔"

"ضمیر صاحب سے تو ابھی میری ہمّت نہیں ہوئی کہنے کی۔ میں آپ کے اس خط کا ذکر بھی نہ کر سکا۔"

"خیر اب سہی۔"

"ابھی میں کچھ مفید نہیں سمجھتا ہوں۔"

"ایک فائدہ ہے راشد!"

"کیا؟"

ارشی پر اس کا اثر بہت اچھا پڑے گا۔ اگر اُسے معلوم ہو گیا کہ اس کی نسبت وہاں طے پا گئی تو وہ اسی سانچے میں ڈھلنے کی کوشش کرنے لگے گا جس کے ڈھلے ہوئے نمونے وہ یہاں سے دیکھ کر گیا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ماحول اُسے نہ جانے کیا بننے پر مجبور کر دے۔ تم بھی چاہتے ہو کہ تمہارا بھتیجہ تم لوگوں جیسا ہی بنے۔"

بھائی صاحب! ظاہر ہے کہ یہ تو ہمارے دل کی آواز ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتا ہوں۔ اپنے پورے خاندان کے لیے آپ کے تو خصوصی احسانات ہیں مجھ پر۔"

"تو پھر بسم اللہ کر کے آج ضمیر صاحب سے کہو۔ مجھے امید ہے کہ

اگر تم ان کو سمجھاؤ گے تو وہ ضرور مان لیں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ رضیہ کی کم عمری کا بہانہ کر دیں گے اور آپ جانتے ہیں کہ یہ بھی ایک طرح کا انکار ہی ہے۔ اس انکار سے آئندہ کے لیے راہ رُک جائے گی۔ میں چاہتا ہوں بات اس وقت ڈالی جائے جب وہ خود خواہشمند ہوں۔"

"تمہاری بھابی بضد ہیں کہ بس اطمینان ہو جائے تاکہ دوسری جگہ لڑکی تلاش کرنے کے جھنجھٹ سے بچ جائیں شادی پھر ہو جائے گی۔"

"میری رائے ہے کہ ابھی آپ رُکے رہیئے۔"

"میری رائے ہے کہ نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیئے۔"

"میرا خیال ہے کہ اس کے لیے پہلے سے زمین ہموار کرنا چاہیئے۔"

"میرا خیال ہے کہ میری حمایت میں تمہارا وجود ہی کافی ہے۔"

"مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں جلدی میں کام بگڑ جائے۔"

"مجھے اندیشہ ہے کہ اس وقت بات نہ بنی تو پھر بن ہی نہیں سکتی۔"

"کیوں؟"

بھائی! میں زندہ ہوں۔ تم موجود ہو۔ کل خدا جانے کون مرے کون جیے۔ پھر کون یہ پاپڑ بیلے گا۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ رشتہ طے ہو جائے تو میرا آنا جانا جلد ہو سکے گا اور اس بہانے تم کو جلد جلد دیکھ لیا کروں گا ورنہ کسی واسطے کے بغیر کون کہیں جاتا ہے۔

"میں نے اب تک ضمیر صاحب سے جو کچھ کہا ہے وہ سب انہوں نے مان لیا ہے لیکن اس بارے میں میں کھٹک رہا ہوں کہ کہیں وہ انکار نہ کر دیں۔"

یہ تو تمہارے کہنے پر ہے۔ تمہارے ان کے جو تعلقات ہیں ان سے مجھے بڑی امید ہے۔

لیکن یہ خصوصی مسئلہ ہے جس پر ابھی تک غور کرنا درکنار ابھی ادھر ہمارا دھیان

ہی نہیں گیا۔"

"آخر توجہ کرنی ہوگی ہی۔ کل نہ سہی آج ہی سہی۔ بہر حال اب جب میں اسی غرض سے آیا ہوں۔ تم کو یہ کام کرنا ہی ہوگا۔"

"آپ مجھے بڑی سخت آزمائش میں ڈال رہے ہیں۔"

"مجھے تمہاری سعادت مندی سے پوری پوری امید ہے۔"

راشد علی خاں صاحب نے لاکھ پیچھا چھڑانے کی کوشش کی لیکن مرشد علی خاں کب چھوڑنے والے تھے۔ انہوں نے سونے سے پہلے وعدہ لے لیا کہ کل وہ پہلا کام یہی کریں گے کہ ضمیر صاحب سے رشتے کی بات چیت کریں۔

صبح کو بادلِ ناخواستہ بھائی کو لے کر وہ ضمیر صاحب کے یہاں گئے۔ مدّعا ان کے سامنے رکھا تو وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ سمجھ تو گئے کہ راشد صاحب نے بھائی کے مجبور کرنے سے یہ بات کہی ہے لیکن مرشد علی خاں صاحب کے سامنے صاف صاف انکار نہ کر سکے۔ جواب دیا "غور کرنے اور مشورہ کرنے کے بعد جواب دیا جائے گا۔"

اس کے بعد وہ مرشد علی صاحب سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ ان کے بچوں کی خیریت پوچھی۔ بچے کیا پڑھتے ہیں۔ ان کے رجحانات کیا ہیں۔ وغیرہ ان سوالات کے جوابات دینے میں۔ مرشد علی خاں صاحب نے بڑے غلو سے کام لیا اور یہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ ارشی خصوصیت سے دین کی طرف بہت مائل ہے۔

مرشد علی خاں جتنی دیر بیٹھے رہے، ضمیر صاحب نے اخلاقاً یہ نہیں ظاہر ہونے دیا کہ وہ اس رشتے کو پسند نہیں کرتے۔ مرشد علی خاں بھائی کو اب یہ اشارہ دینے لگے کہ عندیہ معلوم کریں تاکہ اطمینان ہو جائے۔ مگر ضمیر صاحب نے ایسی جچی تلی بات کہی تھی کہ اس کے بعد کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ کچھ دیر بیٹھ کر یہ صحبت ختم کر دی گئی۔ واپسی پر مرشد علی صاحب نے راشد علی صاحب سے کہا۔ اب میرا ارادہ ہے کہ تین والی گاڑی سے لکھنؤ چلا جاؤ

ضمیر صاحب کے جواب سے جلد مطلع کرنا۔ اور دیکھو بھئی، میں بہت پُر امید جا رہا ہوں۔

اس کے جواب میں راشد صاحب نے صرف "انشاءاللہ" کہا اور پھر مرشد علی خاں صاحب تین والی گاڑی سے لکھنؤ جانے کی تیاری کرنے لگے۔"

لکھنؤ پہنچنے کے بعد بیوی کی ضد پر ہر ہفتہ ایک خط راشد صاحب کے پاس بھیجنے لگے کہ نسبت ٹھہرا کر جلد مطلع کرو۔ آئے دن کے ان خطوط سے راشد صاحب پریشان ہو گئے۔ اور آخر ایک دن وہ سارے خطوط ضمیر صاحب کے سامنے رکھ دیئے اور کہا کہ خدا کے واسطے بتائیے میں کیا جواب دوں؟ ضمیر صاحب نے کہا " اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ انہیں لکھ دیجئے کہ ضمیر مطمئن نہیں ہے۔"

اسی دن راشد صاحب نے بھائی کو انکاری خط لکھ دیا ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ میں ضمیر صاحب کو بہت سمجھایا برسوں کے تعلقات کا واسطہ دیا مگر وہ مطمئن نہ ہو سکے۔

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟

"دن میں تم کیا بات کہتے کہتے رک گئے تھے؟"
"کس وقت؟"
"وہ کیا جب کھانا کھا چکے تھے۔ ڈاکٹر احمد صاحب کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ آشا آگئی تو چپ ہو گئے۔"
"ہاں، یاد آیا۔ تو سمجھی نہیں تھیں!"
"کچھ سمجھی کچھ نہیں سمجھی۔"
"یہ کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی والی بات کیا رہی؟"
"تم کچھ اس طرح کہہ رہے تھے کہ جیسے آشا کے بارے میں ڈاکٹر صاحب سے ...!"
"ذرا ٹھہرو، کیا آشا سو گئی؟"
ہاں، وہ سو گئی ہے۔ تب ہی تو میں نے بات چھیڑی۔ نہیں تو کیا میں ایسی

نادان ہوں کہ کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ آشا کے سامنے اس کی شادی کے بارے میں باتیں کرنا ٹھیک نہیں۔"

"اچھا تو سنو! میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ میری بیٹی آشا رانی کی شادی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہو جائے۔ بڑا اچھا جوڑ ہے آشا کی ماں! تم خود سوچو بائیس برس کی یہ ہو گئی اب اس کے لیے ہمارے سماج میں بر کہاں مل سکتا ہے۔ ہمارے یہاں تو بچپن ہی میں لڑکوں لڑکیوں کی شادی ہو جاتی ہے شادی نہیں بھی ہوتی تو منگنی ہو جاتی ہے۔

"یہ تو اس لیے ہوا کہ تمہاری اب تک کی زندگی جیسی گذری وہ کچھ اور تھی۔ ایسوں کے یہاں کون رشتہ ناتہ کرتا ہے۔"

"بے شک۔ مجھے اپنے گناہوں کا اقرار ہے اور میں ان کے لیے اپنے خدا سے معافی مانگتا ہوں۔ ہمارا تمہارا خدا بڑا مہربان ہے۔ وہ چاہے تو ذرّے کو آفتاب بنا دیتا ہے۔ عزت دینا اسی کے بس میں ہے اور وہ ذلیل بھی کر سکتا ہے۔ مجھے اپنے رب سے خیر ہی کی امید ہے۔"

"مگر ایک بات تو بتاؤ۔ ڈاکٹر صاحب تو جنم کے مسلمان ہیں اور ہم ٹھہرے نئے نئے مسلمان۔ وہ ہماری لڑکی کر لیں گے۔ پھر یہ کہ وہ اتنے پڑھے لکھے اور ہماری بیٹی ہندی کے سوا کچھ جانتی نہیں۔ جوڑ کیسے ملاؤ گے؟"

مجھے تو اللہ پر بھروسہ ہے۔ ویسے اللہ تعالیٰ نے جو عقل ہمیں دی ہے اس سے میں نے سوچا ہے کہ یہاں سے چل کر اسے کسی مولوی سے اسلامی تعلیم دلا دوں گا رہی یہ بات کہ وہ بچپن کے مسلمان ہیں تو اس بارے میں میں نے بہت سی اسلام کی خوبیاں تمہارے سامنے بیان نہیں کیں۔ اسلام کی باتیں جیسے جیسے مجھے معلوم ہوتی جاتی ہیں، میرے دل میں اسلام کی بڑائی بیٹھتی جاتی ہے۔ دیکھو تو شادی بیاہ کے بارے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اور قرآن کا حوالہ دے کر سمجھایا

کہ شادی بیاہ اس سے کرو جو دیندار ہو، چاہے وہ کوئی لونڈی غلام ہی ہو دیندار لونڈی اور غلام بے دین مالدار حسین اور اونچے گھرانے کے لوگوں سے بھی بہتر ہیں۔ دیکھا تم نے آشا کی ماں! کیسی پیاری شکشا ہے یہ! اسلام نے عورت کو اور بہت سے حق دیئے ہیں۔ گھر اور جائداد میں بھی۔ اسلام میں ماں کے قدموں کے نیچے جنت بتائی گئی ہے۔ سنا تم نے اگر ہم تم سب نے دین اسلام کی رسّی کو مضبوط پکڑ لیا تو ہمارا اللہ ہماری مدد ضرور کرے گا۔ وہ اس دنیا میں بھی عزت دے گا اور اس دنیا میں بھی مہربانی فرمائے گا جب ہم سب اپنے اپنے کرموں کا حساب دینے اس کے سامنے حاضر کیے جائیں گے۔

بل بل جاؤں۔ بھگوان تیری بڑی دیا ہے کہ تو نے ہمیں ایسا اچھا دین دیا۔ اچھا دیکھو ٹھاکر اب یہاں سے جلد سے جلد نکل چلو۔ اب یہاں کچھ کرنا تو باقی رہا نہیں۔ زمین تم بیچ چکے گھر کا سامان بھی اب یوں ہی سا رہ گیا ہے۔ وہ میں پڑوسن کو دیدوں گی۔ وہ لوگ مجھ سے پوچھا کرتے ہیں۔" ٹھکرائن! کیوں سب بیچے ڈالتی ہو؟ میں نے اُن کو وہی بات سمجھا دی جو تم نے کہی تھی کہ یہاں اب ٹھاکر چاہے بھگت بن کر رہیں گے، ان پر بھروسہ نہیں کیا جائے گا۔ اب تو ارادہ یہ ہے کہ ایسی جگہ جا کر رہیں جہاں کوئی جانتا نہ ہو۔ میں نے اوپری دل سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ میں تم سب کو خط بھجواتی رہوں گی۔

"رہا للاّ کا معاملہ۔ خدا نے اُسے بھی اطمینان کی جگہ پہنچا دیا ہے۔ آگے بھی اللہ مالک ہے۔ مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تم آج کل کرکے ٹالتے کیوں ہو؟"

"آشا کی ماں! میں جب چلنے کا ارادہ کرتا ہوں تو مجھے کچھ ایسا ڈر لگنے لگتا ہے جیسے راستے میں شیر اور اژدہے منہ کھولے ہمارا انتظار کر رہے ہوں۔ میرا دل کہتا ہے کہ راہ میں کچھ نہ کچھ خطرہ ضرور ہے۔ ابھی تک میں نے بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ ہر خطرے کا منہ اپنی حد تک بند کر دیا ہے پھر بھی دل بے چین سا معلوم ہوتا

شاید وہ خدا جس پر ہم تم ایمان لائے ہیں ہمارا تمہارا امتحان لینا چاہتا ہے۔

ٹھاکر! تمہاری جیسی سمجھ مجھ میں تو نہیں پر ایک بات کہتی ہوں۔ خدا اگر ہمارا امتحان لینا چاہتا ہے تو وہ لے کر رہے گا۔ ہونہار ٹل تو سکتی نہیں۔ پھر کیوں نہ اٹھادیں اس کی راہ میں قدم وہی امتحان بھی لے گا' وہی امتحان میں کامیاب اور سپھل کرے گا۔ اور پھر وہی ہمیں اگلا درجہ بھی تو دے گا۔ لڑکے جب امتحان پاس کرتے ہیں تو اگلا درجہ پلتے ہیں۔ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے ویسے تم مرد لوگ زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہو''

ارے واہ! آشا کی ماں! تم نے آنکھیں کھول دیں۔ کون کہتا ہے کہ عورتیں کم عقل ہوتی ہیں۔ کیسی اچھی بات اس وقت تم نے کہی۔ خدا تمہارا بھلا کرے اچھا تو اب تیاری کرلو۔ پرسوں صبح یہاں سے نکل چلیں۔ ہم سب کا خدا مالک اور حافظ ہے''

''ٹھاکر اب تم بڑے اچھے اچھے شبد اور بول بولنے لگے ہو۔ میری زبان پر ابھی یہ شبد نہیں چڑھے۔ 'اللہ' مالک' حافظ' رحمٰن' رحیم' رب' پروردگار کیسے اچھے شبد ہیں۔ میں بھی کوشش کر رہی ہوں اور یہ تو مجھے سکھا ہی دو جو تم نے حضرت محمد صاحبؐ کا نام لینے کے بعد پڑھا تھا۔''

ہاں' وہ تم بھی یاد کرلو اور آشا کو بھی یاد کرادو۔ میں نے تم کو بتایا کہ حضرت محمد صاحبؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہم انسانوں پر بڑے بڑے احسانات ہیں۔ انہوں نے بے راہ اور بھٹکتی دنیا کو سیدھا راستہ دکھایا۔ اللہ کی مرضی پر چل کر دکھایا۔ اللہ کے احکام کچھ گھٹائے بغیر ہم تک پہنچا دیئے۔ دیکھو تو آشا! ہمارے باپ دادا ہماری پرورش تو کر سکتے ہیں۔ ہمیں اچھا کھلا اور اچھا پہنا تو سکتے ہیں لیکن یہ سب اسی دنیا تک تو! آخرت کے حساب کتاب میں سپھل اور کامیاب ہونے کے لیے وہ کچھ نہیں کر سکتے وہاں کامیاب ہونے کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے جو طور طریقہ بتایا ہے'

وہ ہمارے لیے سب کچھ ہے۔ ان کے اس احسان پر ہم ان کی بڑائی مانیں، زبان سے بھی ان کا احسان مانیں اور دل میں ان سے اتنی محبت کریں کہ ماں باپ اور سارے رشتہ ناتہ کے لوگوں سے ان کی محبت بڑھ جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا احسان ماننے کے لیے خود اللہ پاک نے قرآن میں فرمایا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو وہ بول بتا دیئے ہیں، مسلمان یہی بول حضورؐ کے نام کے ساتھ بولتے ہیں۔ یوں کہتے ہیں میں کہتا ہوں میرے ساتھ تم بھی کہو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور دیکھو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم یاد آئیں تو اس طرح بھی پڑھ لیا کرو۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ اس طرح کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ حضرت محمدؐ پر درود اور سلامتی اُتار اور آپ کے ماننے والوں پر بھی اپنی برکت اور سلامتی اُتار اور ہاں تو کہو آشا کی ماں۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ۔

ٹھاکر اپنی ٹھکرائن کانتا کو درود شریف یاد کراتے رہے دونوں کو نیند نہیں آرہی تھی۔ دونوں یہ سمجھتے تھے کہ آشا سو رہی ہے۔ ہاں وہ سو تو رہی تھی لیکن پھر باتیں کرنے کی آواز سے جاگ گئی اور اس نے وہ سب کچھ سن لیا جو اس کی شادی کے بارے میں ماں باپ سوچ بچار کر رہے تھے ظاہر بات ہے کہ آشا بچی تو تھی نہیں وہ چپ پڑی سنتی رہی اُس کے بعد اُسے نیند نہیں آئی۔ کیوں نہیں آئی۔ یہ تو وہی جانتا ہے جو اس عمر سے گذرا ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ شادی بیاہ کی نوید میں جو لذت نوجوانوں کو ملتی ہے اُسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں جب اس کی یاد آتی ہے تو رات بھر نیند نہیں آتی۔ یہی حالت آشا کی تھی۔ اس حالت میں اُس نے مناسب سمجھا کہ وہ بھی درود شریف پڑھتی رہے۔ چنانچہ دل ہی دل میں وہ وہی بول دُہراتی رہی جو اس کی ماں کو باپ نے سکھائے تھے اور اس نے سُن لیے تھے۔

افتاد

ویسے تو عورتوں کے ڈبے میں بہت سی برقع پوش خواتین تھیں لیکن دو برقع پوش ڈبے کی ساری عورتوں کیلئے مرکز توجہ بنی ہوئی تھیں۔ یہ دونوں ایک کونے میں سمٹی سمٹائی بیٹھی تھیں۔ دلی سے چلے ہوئے قریب قریب آدھا دن ہو چکا تھا۔ اسٹیشن پر اسٹیشن گذر چکے تھے۔ نہ جانے کتنے مسافر اترا اور چڑھ چکے تھے۔ کتنوں ہی نے اسٹیشنوں پر پھل، میوے، چاٹ اور چائے سے شغل کیا تھا۔ عورتوں نے اپنے پاس بیٹھی ہوئی عورتوں سے باتیں کیں لیکن ان دونوں نے آپس میں تو چپکے چپکے کبھی کبھی کچھ کہا سنا کسی اور سے متوجہ نہ ہوئیں۔ نہ کسی اسٹیشن پر کچھ خریدا اور نہ کچھ کھایا پیا۔ مسافر عورتوں نے یہ ضرور دیکھا کہ کسی کسی اسٹیشن پر ایک آدمی ڈبے کے پاس آیا اور چپکے چپکے ان سے کچھ کہہ کر یا پھل دے کر چلا گیا۔ یہ باتیں ایسی نہ تھیں کہ زیادہ قابل توجہ ہوتیں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو باتیں نہیں کرتے خصوصاً سفر میں سب سے الگ تھلگ رہنا ہی پسند

کرتے ہیں لیکن ان دونوں برقع پوش عورتوں کی ایک اور بات نے ڈبے کی ساری عورتوں کو ان کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ ان دونوں نے عورتوں کے ڈبے میں بیٹھے ہونے کے باوجود اپنے اپنے برقع کا نقاب نہیں اُلٹا تھا۔ ان کی اس حرکت نے مسافر عورتوں کے دلوں میں طرح طرح کے خیالات پیدا کر دیئے تھے۔ "کیا یہ انتہائی پردے کی وجہ سے نقاب نہیں اُلٹ رہی ہیں؟" "کیا یہ بھاگی ہوئی ہیں؟" "بہر حال ہیں مشتبہ!" اور یہی آخری خیال مسافر عورتوں کے ذہن نشیں ہو گیا۔ سب انہیں شک، تعجب اور خوف کی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ کچھ عورتوں نے آپس میں سرگوشی بھی کی۔ آخر ایک مسلمان بوڑھی عورت سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ ان سے مخاطب ہو ہی گئی۔

"تم کیسی پردہ دار ہو کہ عورتوں میں بھی نقاب نہیں اُلٹتیں؟"

اس کا یہ کہنا تھا کہ دونوں عورتوں نے گھبرا کر نقاب اُلٹ دی۔ مسافر عورتوں نے دیکھا کہ ان میں سے بائیس۲۲ تئیس۲۳ سال کی ایک نوجوان، تندرست اور حسین لڑکی بھی ہے۔ کچے پکے چہرے والی بڑی بڑی آنکھوں والی، بھولی بھالی صورت والی اور سیدھی سادی سی تمام عورتوں کے دلوں سے وہ خیال جاتا رہا۔ جو انہوں نے قائم کر رکھا تھا۔ مسلمان عورت نے اس عورت سے پوچھا:۔

"کہاں سے آ رہی ہو؟"

"دہلی سے!" جواب ملا۔

"مکان دہلی ہی میں ہے؟" اس نے پھر پوچھا۔

"نہیں مکان تو ضلع بستی میں ہے۔"

"پھر دلی کیوں گئی تھیں؟"

اس سوال پر عورت جھجکی تو پاس بیٹھی ہوئی دوسری عورتوں نے پھر کان کھڑے کیئے۔ بوڑھی عورت نے پھر کہا:۔

"تم نے بتایا نہیں۔ دلی کیوں گئی تھیں؟"

"ہم جامع مسجد دیکھنے گئے تھے۔"

"تم ضلع بستی سے جامع مسجد دیکھنے دلی گئیں تھیں۔ لال قلعہ بھی دیکھا؟"

"نہیں لال قلعہ تو نہیں دیکھا!"

"کیا آگرہ کا تاج محل بھی دیکھنے گئی تھیں۔"

"نہ، وہاں تو نہیں گئیں ہم۔"

"اور اجمیر شریف؟"

"وہاں بھی نہیں!"

خوب، بستی سے اتنا لمبا سفر صرف جامع مسجد دیکھنے کے لیے کیا گیا!"

اس گفتگو نے پھر تمام مسافر عورتوں کو شک میں مبتلا کر دیا۔ بوڑھی عورت نے مزید کریدا۔

"یہ لڑکی تمہاری کون ہے؟"

"یہ میری بیٹی ہے۔"

"اس کا نام کیا ہے؟"

"آشا"

"آشا یا عائشہ۔ تم تو مسلمان ہو نا؟"

"ہاں عائشہ ہی تو!" برقع پوش عورت ذرا گھبرائی۔

"اور تمہارا کیا نام ہے؟"

"میرا نام کانتا ہے۔"

"پھر وہی ہندوانہ نام۔ قانتہ کیوں نہیں کہتیں؟"

"قانتہ ہی تو!" برقع پوش کی گھبراہٹ کچھ اور بڑھی اور اس کی اس گھبراہٹ

کو دوسری مسافر مسلم اور غیر مسلم سب ہی عورتوں نے محسوس کیا۔ اب سب نے ادھر کان لگا دیئے اور نظریں جما دیں۔ بوڑھی عورت سوال پر سوال کیے جا رہی تھی۔

"تمہاری بیٹی کا چہرہ کچا کچا سا لگتا ہے۔ اس کے حق سے ادا ہوئیں یا نہیں تم؟"

ابھی تو کہیں بات طے نہیں ہوئی ہے جہاں اس کے بھاگیہ میں ہوگا وہیں ہوگا اس کا وواہ۔

ڈبے میں بیٹھی ہوئی عورتوں کا شک اور بڑھا۔ انہیں اس برقع پوش مسلمان عورت کے لب و لہجہ پر بھی شبہ تھا۔ شبہ یہ کہ ہے تو مسلمان لیکن لب و لہجہ ہندوؤں جیسا ہے۔

مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔" یہ کہہ کر بوڑھی مسلمان عورت تو خاموش ہو گئی لیکن وہ سب کے کان کھڑے کر گئی۔ مراد آباد کا اسٹیشن قریب آ گیا تھا۔ مسافر اترنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ اسٹیشن آیا۔ یہاں بریلی جانے والی دوسری گاڑی تیار کھڑی تھی۔ اس طرف جانے والے مسافر مرد اور عورتیں اتر اتر کر اس پر سوار ہونے لگے۔

ٹھیک اس وقت جب دہلی سے آنے والا مرد اپنے ساتھ کی دونوں برقع پوش عورتوں کو بریلی والی گاڑی کے زنانہ ڈبے میں بٹھا رہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی ایک عورت ایک مرد سے ان کی طرف اشارہ کر کے کچھ بتا رہی تھی۔ مرد سن کر "ہاں ہاں ہوں ہوں" کر رہا تھا۔ پھر اس نے نوٹ بک نکالی۔ اس پر کچھ لکھا اور اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں چلا گیا۔

کچھ دیر کے بعد گاڑی چل دی۔ رام پور کا اسٹیشن بخیریت گذر گیا۔ اگلے اسٹیشن ملک پر جیسے ہی گاڑی رکی چار سپاہی زنانہ ڈبے کے پاس اکھٹے ہوئے اور انہوں نے ان دونوں برقع پوش عورتوں سے سوالات کرنا شروع کر دیئے جو دہلی سے

آرہی تھیں۔ دونوں عورتیں گھبرا گئیں۔ ابھی کوئی کارروائی عمل میں نہیں آئی تھی کہ ان کے ساتھ کا مرد اپنے ڈبے سے اُتر کر آگیا اور سپاہیوں سے پوچھنے لگا۔ "کیوں کیا بات ہے۔"

سپاہیوں نے بتایا کہ ہمیں مراد آباد سے اطلاع ملی ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت ایک نوجوان لڑکی کو اغوا کیے ہوئے لیے جارہے ہیں۔ کیا ان کے ساتھ آپ ہی وہ مرد ہیں؟"

"ہاں، میں ہی وہ مرد ہوں۔ مجھ سے پوچھیے جو پوچھنا ہو۔"

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"میرا نام اسلام الدین ہے۔"

"یہ عورتیں آپ کے ساتھ کون ہیں؟"

"یہ میری بیوی ہے اور یہ بیٹی۔"

"آپ کہاں سے آرہے ہیں؟"

"ہم دلی سے آرہے ہیں۔"

اور آپ کا مکان کہاں ہے؟

"ضلع بستی میں۔"

"دلی کیوں گئے تھے؟"

"ہم مسلمان ہونے کیلئے جامع مسجد دہلی گئے تھے۔"

"مسلمان ہونے! تو کیا آپ تینوں نومسلم ہیں؟"

"جی ہاں!"

"مہربانی کر کے آپ ہمارے ساتھ تھانے چلئے اور وہاں اپنا بیان دیجیے۔"

"کیوں؟ ہم نے مذہب تبدیل کر کے کوئی جرم تو کیا نہیں کہ تھانے چلیں۔"

"کیوں کا جواب بھی آپ کو تھانے ہی میں دیا جائے گا۔"

"کیا آپ کے پاس ہمارا وارنٹ ہے؟"

"وارنٹ نہیں ہے لیکن ہم مراد آباد سے آئی ہوئی اطلاع پر آپ کو تھانے لے جانے پر مجبور ہیں۔"

"لیکن ہم تو مجبور نہیں۔ ہم بریلی جا رہے ہیں۔ آپ ہمارا پتہ نوٹ کر لیجئے۔"

"ہم کو جو حکم دیا گیا ہے ہم وہی کر سکتے ہیں۔ آپ بتائیے کہ سیدھی طرح ہمارے ساتھ چل رہے ہیں یا نہیں؟"

"پولیس کو عورتوں کے ڈبےّ کے پاس تفتیش کرتے دیکھ کر بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ بعض کہہ رہے تھے کہ جب ڈر نہیں تو تھانے جانے سے کیوں ہچکچاتے ہو بھائی!"

موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے غریب مسافر تھانہ چلنے کو تیار ہو گیا۔ اس نے سپاہیوں سے کہا۔ سامان اتار لینے دیجئے۔ اس کی اجازت دے دی گئی۔ اس نے سامان اتارا۔ اپنی بیوی اور بیٹی سے کہا کہ ڈبےّ سے نیچے آجاؤ۔ پولیس نے سامان اپنی نگرانی میں لے لیا۔

پولیس ان تینوں کو تھانہ "ملک پر" لے گئی وہاں انہیں انچارج تھانہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے بھی ان کا بیان لیا۔ بیان لینے کے بعد اس نے مزید یہ سوال کیا کہ مسلمان ہونے سے پہلے آپ کا نام کیا تھا؟"

"جھنڈا سنگھ!"

"جھنڈا سنگھ! مشہور و معروف ڈاکو جھنڈا سنگھ!"

"جی ہاں وہی ہوں میں۔ خدا نے مجھے ہدایت دی۔ اب آپ مجھے جانے دیں گے؟"

جی نہیں۔ اب تو آپ کو یہاں حوالات میں رہنا ہوگا۔ کل سپرنٹنڈنٹ پولیس کے سامنے آپ کو پیش کیا جائے گا۔

"لیکن ہمارا جرم تو ہمیں بتائیے۔"

"ابھی تک ہمیں شک تھا اب یقین ہو گیا ہے کہ واقعی ان عورتوں کو اغوا کیا گیا ہے۔"

"دیکھئے داروغہ جی! آپ اسلام الدین کو پھر جھنڈا سنگھ نہ بنائیے۔"

"بہت اچھا حضور!" داروغہ نے طنزاً کہا اور سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ انہیں حوالات میں بند کردو۔

قتل

حولدار راشد علی خاں صاحب نے یکے بعد دیگرے آدھی رات کے بعد آنے والی جنتا اور دہرہ ایکسپریس دونوں کے ڈبوں کو چھان مارا۔ اسلام الدین صاحب کا نام لے کر بھی پکارا لیکن اس طرح مایوسی ہوئی جیسی مایوسی انہیں سہ پہر اور شام کی ٹرینوں کے آنے کے بعد ہوئی تھی۔ بے چارے سر جھکائے ہوئے واپس آئے۔ سیدھے ضمیر صاحب کے گھر پہنچے چار بجنے والے تھے ضمیر صاحب بیدار ہو کر تہجد پڑھ رہے تھے کہ یہ پہنچے۔ آواز دی، ضمیر صاحب نے جلدی جلدی سلام پھیرا۔ اٹھے جا کر کواڑ کھولے اور راشد علی خاں کو تنہا دیکھ کر سمجھ تو گئے کہ مہمان نہیں آئے۔ پھر بھی پوچھا:۔

"اسلام الدین صاحب تشریف لائے؟"

"نہیں، ان ٹرینوں سے بھی نہیں آئے۔"

"شاید وہ ابھی دہلی سے نہ چلے ہوں؟"

"ہو سکتا ہے کہ دلی کی سیر کرنے لگے ہوں - آج کسی وقت آئیں -"

"یا پھر خدانخواستہ راستے میں کوئی حادثہ پیش آگیا ہو؟"

جہاں تک اندیشوں کا سوال ہے - اسلام الدین صاحب نے جس دوراندیشی سے کام لیا وہ ان کی سمجھ داری کا بین ثبوت ہے - سب سے بڑا اور اندیشہ ناک مسئلہ نابالغ بیٹے کا تھا - وہ الحمدللہ نہایت اطمینان بخش جگہ پر ہے - بیٹی کی جنم پتری ان کے پاس ہے - اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ بائیس تیئس برس کی ماشاءاللہ بالغ اور جوان ہے - اس پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا - پھر جس خوبصورتی، خاموشی اور احتیاط کے ساتھ وہ گھر سے نکلے - دلی پہنچے وہ سب ایک ہوشمند انسان کا ہی کام کہا جا سکتا ہے - سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا حادثہ ہو سکتا ہے کسی ٹرین کے ٹکرانے یا پٹری سے اتر جانے کی بھی خبر نہیں ملی -"

"لیکن بھائی! "افتاد" تو کسی کے بس میں نہیں - "افتاد" کسی منطق اور منصوبے کی ماتحت نہیں ہے - انسان اپنی ہی جیسی کوشش اور تدبیر کرتا ہے لیکن ہو کچھ سے کچھ جاتا ہے میرا خیال ہے کہ راستے میں ہی کوئی افتاد پڑی ہے - شاید کسی کو ان کی باتوں پر شبہ ہو گیا - اس نے کسی فرقہ پرست کو اطلاع دے دی اور وہ بے چارے راستے ہی میں دھر لیے گئے -"

"اللہ تعالیٰ ان کو اپنے حفظ و امان میں رکھے -"

"آمین!"

"تو فرمائیے ہمیں کیا کرنا چاہیئے -"

"صبح ہوتے ہوتے ایک کام تو یہ کیجئے کہ اس طرف سے آنے والے اخبار حاصل کرنے کی کوشش کیجئے - اگر رامپور میں کوئی حادثہ ہوا ہے تو وہ صبح ہوتے ہی معلوم ہو جائے گا - ورنہ دوسرے اخبار شاید کچھ بتائیں -"

"یہ تو میں کرلوں گا لیکن نہ جانے کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے"

"اندیشے میرے دل میں بھی آتے ہیں" لاحول" پڑھیے"

حولدار صاحب اور ضمیر صاحب میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ فجر کی اذانیں ہونے لگیں۔ اذان سن کر حولدار صاحب نے وہیں وضو کیا۔ سنّت پڑھی پھر ضمیر صاحب کے ساتھ مسجد چلے گئے۔ جماعت سے فرض ادا کی۔ امام نے سلام پھیرا ہی تھا کہ رشاد نے آکر حولدار صاحب کے کان میں چپکے سے کچھ کہا راشد صاحب اُٹھے اور ضمیر صاحب کو اشارہ کر کے نہایت جلدی کے ساتھ مسجد سے نکل گئے۔ گھر کے دروازے پر پہنچے تو ایک سپاہی کو دیکھا اس نے سلام کیا اور کہا:۔

"فوراً ملک تھانے چلیے۔ اور اس نے ایک پرچہ پیش کیا:۔

"کیوں خیریت تو ہے" حولدار صاحب نے پرچہ لے لیا اور اس پر ایک نظر ڈالی۔

"حولدار صاحب! اس نالایق قادر یار خاں تھانے دار کو تو آپ جانتے ہی ہیں وہ آج رات اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔"

ارے بھئی، یہ بتاؤ ہوا کیا ہے؟ تمہارے خط میں تو صرف میری فوراً طلبی ہے اور لکھا ہے کہ قتل ہو گیا۔ میرا اس سے کیا تعلق؟

کیا عرض کروں حولدار صاحب! اس نالایق نے آج ایک لڑکی کو کسی طرح پھانسا۔ رات کو کمرے میں بند کر رکھا اس کے ہاتھوں ان حضرت کا پستول لگ گیا۔ لڑکی تھی کسی غیرت دار خاندان کی۔ اس نے پستول رنگیلے شاہ پر جھونک دیا۔ اب وہ کواڑ بند کیے ہوئے ہے اور کہتی ہے کہ میں نے داروغہ کو قتل کر دیا لیکن اب کواڑ کھولنے کیلئے یہ شرط لگا رکھی کہ اس کے ماں باپ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور آپ موجود ہوں تو کواڑ کھلیں گے ان سب کے آنے سے پہلے اگر کسی نے کواڑ کھولے تو وہ سمجھ لے کہ پستول میرے

ہاتھ میں ہے۔ کواڑ کھولنے والے کو مرنے کیلئے تیار رہنا چاہیئے۔

اتنی ہی گفتگو ہوئی تھی کہ ضمیر صاحب بھی آ گئے۔ ان کو صورتِ حال بتائی گئی۔ ضمیر صاحب نے سپاہیوں سے پوچھا کہ لڑکی کا نام کیا ہے۔ اس نے بتایا "وہ اپنا نام" "عائشہ" اس طرح لیتی ہے کہ شبہ ہوتا ہے "آشا" اس نے کہا۔"

"اور اس کے ماں باپ کہاں ہیں؟"

وہ سب کل سے حوالات میں ہیں۔ داروغہ قادر یار خاں اس علاقے میں عیاش مشہور ہو چکا ہے اس لیے پبلک لڑکی کی تمنوا ہے۔ بس اب آپ چلیے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ فوراً آپ کو لے کر واپس آؤں۔"

"کپتان صاحب کو لینے کوئی گیا ہے؟"

"وہ آچکے ہیں انھی نے مجھے حکم دیا کہ آپ کو لے آؤں۔"

"اچھا ابھی چلتا ہوں۔"

یہ کہہ کر حولدار صاحب نے رشاد سے کہا (جو کھڑا ہوا یہ ساری باتیں سن رہا تھا) گھر جاؤ بیٹے اور اپنی امّی سے کہہ دینا کہ ابا جان کے ساتھ ملک کے تھانے جا رہا ہوں اور جلدی آؤ تم بھی ساتھ چلو۔"

"رشاد دوڑتا ہوا گھر گیا۔ ماں سے جلدی جلدی حال کہا پھر واپس آ کر بولا "ابّو میاں چائے تیار ہے۔ امی کہتی ہیں بھوکے مت جائیے۔"

یہ سن کر حولدار صاحب نے ضمیر صاحب اور سپاہی کی طرف دیکھا اور پھر رشاد سے کہا جلدی کمرے میں لے آؤ۔ سب نے جلدی جلدی ناشتہ کیا۔ گرم گرم چائے غٹ غٹ منہ میں انڈیل لی اور اٹھ گئے۔ پھر سپاہی سے کہا۔ جاؤ ٹیکسی لے آؤ۔ سپاہی ٹیکسی لینے گیا۔ اتنی دیر حولدار صاحب اور ضمیر صاحب آپس میں باتیں اور طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتے رہے۔

سپاہی ٹیکسی لے کر آیا اور ٹیکسی ملک تھانہ کی طرف چل دی جس وقت یہ قافلہ ملک پہنچا اس وقت وہاں سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر شرما سپاہیوں سے کچھ پوچھ رہے تھے وہ اپنے مزاج اور طبیعت کے اعتبار سے نہایت شریف اور سنجیدہ آدمی تھے۔ قادر یار خاں کے کرتوتوں سے واقف تھے۔ اس کے تبادلے کی فکر میں تھے کہ یہ واردات ہو گئی۔

اور کہاں ہیں لڑکی کے ماں باپ؟ انہوں نے منشی اقبال بہادر سے پوچھا۔ منشی جی کانپتی ہوئی آواز میں بولے۔

"حضور وہ دونوں حوالات میں ہیں۔"

"حاضر کرو۔"

ادھر لڑکی کے ماں باپ کپتان صاحب کے سامنے گئے۔ اُدھر حولدار صاحب اس قافلے کے ساتھ پہنچے۔ سلام کیا۔ کپتان صاحب نے سلام کا جواب دیا۔ اس کے بعد مسکرا کر کہنے لگے۔

"ارے بھئی حولدار صاحب! مبارک ہو۔ تم تو بحال ہو گئے نا!

"ہاں صاحب! آپ کی دعا ہے اور خدا کا فضل و کرم۔"

"تو چارج لے لیا۔"

"جی نہیں، اب مجھے نوکری نہیں کرنی ہے۔"

ایک خوشخبری اور سناؤں، تمہارے ایک مہربان نے مجھ سے بتایا کہ اسی ہفتہ میں معطلی کے زمانے کی تنخواہ مل جائے گی۔"

"صاحب شکریہ!"

"شکریہ زبانی نہیں، مٹھائی کھلانی ہوگی۔"

"ضرور ضرور! اس وقت فرمائیے۔ مجھے آپ نے کیسے یاد فرمایا۔"

میں نے نہیں بلایا ہے۔ اس کمرے میں بند لڑکی نے ہم کو تم کو یہ حکم دیا

ہے کہ حاضر ہوں تو بھائی ہم حاضر ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ ہماری بدنامی دھری ہے۔"

اب کپتان صاحب نے اسلام الدین صاحب کو اشارہ کیا کہ آپ کواڑ کھلوائیے اسلام الدین صاحب نے بیٹی کو پکارا اور ان کے پکارتے ہی کواڑ کھل گئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ کمرے سے ایک بائیس تیئس سال کی خوبصورت اور شریف لڑکی ہاتھ میں پستول لیے ہوئے نکلی۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ اس نے فوراً اپنا چہرہ چھپالیا۔ پستول کپتان صاحب کے سامنے رکھ دیا اور پھر اشارہ پاکر اپنی ماں کے پاس جا بیٹھی۔ کمرے کے اندر دارو غنہ ڈھیر پڑا تھا۔

کپتان صاحب نے کمرے کے سامنے کرسیاں ڈلوادیں حوالدار صاحب نے ضمیر صاحب کا تعارف کرایا۔ پھر رشاد کے کان میں کچھ کہا۔ وہ اسلام الدین صاحب اور ان کی بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر پاس گیا اور کہا "چچا میاں! میں رشاد ہوں۔ اسلام الدین صاحب نے ایک نظر دیکھا اور گلے سے لگالیا وہ ابھی کوئی بات رشاد سے نہ کرسکے تھے کہ کپتان صاحب نے انہیں بلایا ان کا بیان اپنے سامنے پھر لیا اسلام الدین صاحب نے مختصراً بتایا کہ وہ اپنی بیوی اور بیٹی کیساتھ جامع مسجد دہلی میں مسلمان ہوئے پھر وہاں سے بریلی روانہ ہو گئے۔ حوالدار صاحب سے پرانی ملاقات تھی۔ سوچا چل کر مل لوں۔ انہوں نے ڈاکو کی شکل میں مجھے دیکھا تھا۔ اب آدمی کی شکل میں بھی دیکھ لیں۔ مراد آباد سے نہ جانے کس نے کیا خبر دے دی کہ ہمیں یہاں کے اسٹیشن پر زبردستی اتار لیا گیا۔ ہمیں حوالات میں بند کر دیا گیا۔ ہمارا سارا سامان پولیس کی نگرانی میں ہے۔ بہت رات گئے، سب سے پہلے مجھے یہ کہہ کر بلایا گیا کہ کپتان صاحب آگئے ہیں۔ وہ بلا رہے ہیں۔ میں سوچنے لگا کہ کپتان صاحب اتنی جلد کیسے آگئے اور پھر یہ کون سا بڑا مسئلہ تھا کہ رات کے وقت تکلیف فرمائیں لیکن مجھے حکم دیا گیا تھا حکم سن کر میں گیا۔ کمرے میں کچھ کرسیاں پڑی تھیں اور ایک طرف پلنگ بچھا ہوا تھا۔

"پلنگ پر آپ تو نہ تھے کوئی اور شخص کپتان بنا بیٹھا تھا۔"

آپ اس شخص کو پہچان لیں گے؟ ان سپاہیوں میں سے تو کوئی نہ تھا؟ کپتان صاحب نے پاس کھڑے ہوئے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا۔

نہیں، ان میں سے کوئی نہ تھا۔ میرے بعد میری بیوی کو بلایا۔ اس سے یونہی چند غیر ضروری سوالات کئے۔ اسے واپس کرنے کے بعد میری بیٹی کو بلایا میری بیٹی گھبرانے لگی لیکن میں نے کہا "گھبراؤ نہیں، کپتان صاحب منشی جی اور داروغہ جی وغیرہ موجود ہیں۔ تم جا کر سچ سچ حال کہہ دینا۔

حضور! کنواری لڑکی۔ اس نے آج تک غیر مرد سے بات نہیں کی تھی۔ وہ گھبرائی ہوئی گئی۔ اس کے بعد اب خود اس سے پوچھ لیجئے۔

"ہوں، اچھا بیٹی! اب تم بتاؤ۔ آگے کیا ہوا؟" کپتان صاحب نے پوچھا تو اسلام الدین صاحب کی بیٹی عائشہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے منہ سے بول نہ نکلے۔ سامنے بڑے بڑے لوگ بیٹھے تھے۔ پبلک کا ایک ہجوم تھانے کے باہر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ بیحد مرعوب ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اس نے کہا

"پانی۔"

لوگ اس کی حالت اچھی طرح سمجھ گئے۔ اسے پانی پلایا گیا حولدار راشد علی خاں نے اس سے کہا۔

بیٹی یہ کپتان صاحب ہمارے بہت مہربان ہیں بہت ہی شریف آدمی ہیں۔ تم پر جو گذرا ہو بے جھجک کہہ دو۔ خدا نے چاہا تو تم کو کچھ نہ ہو گا۔"

حولدار صاحب نے اس طرح کہا تو اسلام الدین صاحب نے بھی ڈھارس بندھائی۔ کپتان صاحب نے بھی تسلّی دی۔ اب ذرا لڑکی کی بدحواسی دور ہوئی۔ اس نے پہلے تو رُک رُک کر اور پھر مسلسل کہنا شروع کر دیا۔ اس نے کہا۔

جب وقت میں کمرے میں پہنچی، اس وقت کمرے میں داروغہ کے علاوہ

کوئی نہیں تھا جو سپاہی مجھے لے کر گیا تھا اس نے باہر آکر کواڑ بھیڑ لیے اور پھر چٹخنی لگالی۔ میں کمرے میں تھانیدار صاحب کو تنہا دیکھ کر گھبرانے لگی۔ سوچ رہی تھی کہ کپتان صاحب کہاں گئے کہ پیچھے کواڑ بند ہونے اور چٹخنی لگنے کی آواز آئی میں سمجھ گئی کہ مجھے کیوں یہاں لایا گیا ہے۔ میری پریشانی بڑھ گئی پھر میں نے اپنے خدا کو یاد کیا۔ جس پر مجھے پورا پورا بھروسہ ہے۔ کمرے میں مجھے اکیلا پاکر داروغہ جی اُٹھے۔ حضور! ان کی لاش دیکھئے۔ پاپی کرتہ اور تہمد باندھے ہے جیسے اپنی ماں بہن یا بیٹی کے ساتھ پاپ کرنے کیلئے تیار ہو کر بیٹھا تھا۔ وہ پلنگ سے اٹھا۔ میری طرف ہنستا ہوا بڑھا۔ حضور! اس وقت میں کیا کہوں میری کیا حالت تھی میں آواز نکالنا چاہتی تھی لیکن آواز میرے منہ سے نہ نکلی۔ دل ہی دل میں خدا کو یاد کر رہی تھی۔ اور نظر داروغہ پر تھی۔ اچانک میری نظر پستول پر پڑی پستول اس کے سرہانے پلنگ پر رکھا تھا۔ میرے خدا نے مجھے سوجھایا۔ میں نے داروغہ سے کہا۔

مجھے پیاس لگی ہے۔" پاپی نے کہا" پانی کے بدلے مزیدار شربت پیو اور پھر وہ شراب کی طرف بڑھا۔ انڈیل کر پہلے خود چڑھانے لگا۔ سوچا ہوگا کہ ایک بیوقوف جال میں پھنس چکی ہے۔ پہلے خود پی لوں پھر اُسے پلاؤں۔ مجھے موقع مل گیا میں نے لپک کر پستول اٹھالیا اور اس پر جھونک دیا اور پھر جو کچھ ہوا۔ وہ سب آپ کے سامنے ہے۔"

بیان دے کر وہ خاموش ہوگئی۔ کپتان صاحب نے پوچھا " تم اس سپاہی کو پہچان سکتی ہو جو تمہیں کمرے میں لے کر گیا تھا۔"

"جی ہاں۔"

"ان میں سے کون ہے؟"

عائشہ نے پاس کھڑے ہوئے سپاہیوں پر نظر ڈالی " ان میں سے کوئی نہیں" اس کی زبان سے نکلا۔ کپتان صاحب نے اسلام الدین صاحب اور عائشہ کی ماں سے کہا " آپ پہچانیے؟" ان دونوں نے بھی یہی کہا کہ ان سپاہیوں میں وہ نہیں۔ اب کپتان صاحب

نے منشی اقبال بہادر سے، پوچھا "کوئی سپاہی غیر حاضر تو نہیں؟"

حضور! سب حاضر ہیں۔" منشی اقبال بہادر نے جواب دیا۔

"تو وہ کوئی پبلک میں سے قادر یار خاں کا لنگوٹیا یار ہوگا۔"

کپتان پولیس کے چہرے پر کسی قدر گھبراہٹ اور تشویش کے آثار تھے اس بیان سے وہ اتر جاتا رہا۔ اس کے بعد انہوں نے کچھ مقامی با اثر اور معزز اشخاص کو تھانے کے اندر بلایا۔ سارا حال بتایا ان کے سامنے لڑکی کو اس کے سرپرستوں کے حوالے کر دیا۔

یہ کارروائی مکمل ہو چکی تو کپتان صاحب حولدار راشد علی خاں کو ایک طرف لے گئے۔ کچھ باتیں کیں پھر رخصت کر دیا۔ حولدار صاحب اسلام الدین اور ان کے اہل و عیال کو لے کر ضمیر صاحب کے ساتھ رامپور کی طرف سے آنیوالی ایک بس پر بیٹھے اور خوش خوش بریلی کی طرف روانہ ہو گئے۔

اسلام الدین صاحب کی کہانی انہی کی زبانی

ہاں تو اب فرمائیے اسلام الدین صاحب! آپ کس طرح مسلمان ہوئے۔ اسلام کی طرف آپ کی دلچسپی کیسے بڑھی اور وہ کیا محرکات تھے جنہوں نے آپ کو مسلمان ہونے پر مجبور کر دیا۔

ضمیر صاحب نے حولدار راشد علی خاں اور ساجد صاحب کی موجودگی میں اسلام الدین صاحب سے پوچھا اور پھر اس طرح ان کی طرف دیکھنے لگے جیسے انہیں یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ اگر ذرا بے توجہ ہوئے تو اسلام الدین صاحب جس لفظ سے اپنی آپ بیتی شروع کریں گے کہیں وہ لفظ سننے سے نہ رہ جائے۔ حولدار راشد علی بھی ہمہ تن گوش تھے۔ اسلام الدین صاحب نے کہا ”زیادہ بہتر ہے کہ رشاد کو بھی بلا کر بٹھا لیا جائے کیونکہ اسلام کی طرف بڑھنے میں سب سے اولین ذریعہ یہی بچہ بنا تھا۔“

”وہ کیونکر؟“ دونوں کی زبان سے ایک ساتھ نکلا۔

"رشاد آلے تو عرض کروں۔" اسلام الدین صاحب کے کہنے پر اس سنجیدہ صحبت میں رشاد کو بھی بلا لیا گیا۔ غیر متوقع طور پر رشاد کو بلایا گیا تو مریم چونکی۔ وہ برقع اوڑھ کر چلی منّی اب پاؤں پاؤں چلنے لگی تھی، اُسے ساتھ لیا اور پڑوس کے مکان میں ہوتی ہوئی ضمیر صاحب کے یہاں پہنچ گئی۔ اس نے ملّانی بی سے کہا اور پھر ملّانی بی نے پتہ لگا لیا کہ اسلام الدین صاحب اپنے مسلمان ہونے کی کہانی اپنی زبانی سنانے والے ہیں۔ یہ موضوع اتنا دلچسپ اور ایمان افروز تھا کہ بھلا ملّانی بی کیسے نظر انداز کر سکتی تھیں۔ چنانچہ وہ بھی رضیہ عائشہ اور قانتہ کو لے کر اس کھڑکی کے پاس بیٹھیں جو مردانے کمرے سے ملحق تھی۔ مردوں کو معلوم ہوا کہ خواتین بھی دلچسپی لے رہی ہیں تو اسلام الدین صاحب سے کہا گیا کہ آپ کھڑکی کے پاس اپنی کرسی کر لیں تاکہ خواتین باآسانی سُن سکیں۔ اسلام الدین صاحب کھڑکی کے قریب ہو بیٹھے اور پھر اس طرح اپنی آپ بیتی سنانے لگے۔

بھائیو اور بہنو! سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے اسلام جیسی نعمت عطا فرمائی۔ یہ سب اسی کی توفیق اور مہربانی سے ہوا ورنہ دراصل میں ایسی راہ پر لگ چکا تھا کہ اگر مجھ پر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو میں آگ کے گڑھے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں سب سے پہلے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں لیکن آپ سب جانتے ہیں کسی کام کے کرنے کیلئے اللہ کوئی نہ کوئی ذریعہ پیدا فرما دیتا ہے تو اسلام کی طرف متوجہ کرنے کے لیے سب سے پہلا ذریعہ یہ بچہ رشاد بنا جو اب ماشاء اللہ نوجوان ہے۔

حولدار صاحب کو یاد ہوگا کہ جب رشاد پانچ چھ برس کا تھا، اس وقت میں یہیں کی جیل میں تھا میں ایک ڈاکے میں ماخوذ ہوا تھا اور اسی میں مجھے تین سال کی سزا ہوئی تھی۔ جب میں سزا کاٹ رہا تھا تو ترویدی جی جیلر بن کر آئے تھے، جو اب رائے بریلی میں ہیں اور شاید ریٹائرڈ ہونے والے ہیں۔ انہوں نے آتے ہی آتے حکم دیا کہ جب وہ معائنہ کے لیے گشت کو نکلیں تو تمام قیدی صف بستہ ہو کر کھڑے ہو جائیں۔ دراصل یہ جیل کا قانون نہ

تھا۔ جیلر صاحب نے یہ اپنا حکم ٹھونسا تھا۔ انہوں نے کچھ اور سختیاں شروع کی تھیں۔ قیدی ان سے دل ہی دل میں ناراض ہو چکے تھے۔ سب بہانہ ڈھونڈھ رہے تھے، اُسی دوران مجھے مقادم سے ہٹا کر پھر کام پر لگا دیا گیا تو مجھے بڑا رنج ہوا۔ مجھے یہ رنج تھا ہی کہ جیلر صاحب کا نادر شاہی حکم صادر ہوا کہ جب وہ گشت کو آئیں تو سارے قیدی ادب سے کھڑے ہو جائیں میں نے کہا کہ جیل کا یہ قانون تو نہیں کہ جب جیلر صاحب گشت کو نکلیں تو ہم سب غلاموں اور داسوں کی طرح سر جھکا کر ان کے سامنے کھڑے ہو جائیں۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے میں زمیندار تھا۔ آزادی کے بعد جب سرکار نے زمین لے لی تو میں نے دیکھا کہ میرے پاس صرف پچاس بیگہ ہی زمین رہ گئی۔ ظاہر ہے کہ جو اپنی زندگی رئیسوں کی طرح گذار چکا ہو وہ پچاس بیگہ زمین سے کیسے گذارا کر سکتا ہے۔ میری طرح کچھ اور زمیندار اور گاؤں ٹھکرے تھے۔ ہم سب پر ردعمل یہ ہوا کہ ہم نے ڈاکہ زنی شروع کر دی۔ ہمارا نشانہ زیادہ تر نیتا قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے جو نیتاجی جوتیاں چٹخاتے پھرتے تھے وہ کانگریسی حکومت میں لعلوں لعل ہو گئے۔ ان کی کوٹھیاں بننے لگیں۔ ان کا اقتدار بڑھ گیا۔ اور ہم گرتے گرتے اس حالت کو پہنچ گئے کہ ایک بار جب جگن بابو ہمارے گاؤں میں تشریف لائے تو ہمیں سلامی کیلئے بلا بھیجا ایک میں ہی نہیں۔ ٹھاکر دگیجے سنگھ، کنول پور کے درگامل جی اور سانوالی کے ٹھاکر پرشادجی کو بھی بلایا گیا۔ ہم سے یہ ضبط نہ ہو سکا۔ ہم نے آپس میں صلاح کر کے اتر کی طرف بنوں کی راہ لی اور پھر جب رات کے وقت جگن بابو ہمارے گاؤں میں بھاشن دے رہے تھے، زمینداروں کے خلاف بول رہے تھے۔ ٹھیک اسی وقت ہمارے ایک ساتھی نے تاک کر ایسی گولی ماری کہ ان کے منہ کے اندر گلے میں گھس گئی اور وہ اسٹیج پر ڈھیر ہو گئے۔ پھر کیسا جلسہ کیسا جلوس۔ سب درہم برہم ہو گیا۔ تفتیش ہونے لگی کہ کس نے یہ قتل لیا۔ ثابت تو نہ ہو سکا لیکن ہم سے بندوقیں واپس لی جانے لگیں۔ ہمارے کچھ ساتھیوں نے ڈر کر بندوقیں داخل کر دیں لیکن ہم چار ٹھاکروں نے

جن کے نام ابھی میں نے لیے بندوقیں دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ہمارا جتھہ بڑھنے لگا اور ہم بیشتر نیتاؤں کو ٹھکانے لگانے لگے۔ آخر ایک بار میں پکڑا گیا۔ مقدمہ چلا۔ قتل تو مجھ پر ثابت نہ ہو سکا لیکن مجھے جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ میں قیدی تو بن گیا لیکن میرا مزاج وہی رئیسانہ تھا۔ جیلر صاحب کا نادری حکم میں کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ میں نے بھوک ہڑتال کر دی ایک دن مجھ پر سختی ہوئی تو میں نے چکّی کا پاٹ اٹھا لیا اور پکارا کہ جو میرے پاس آئے گا اس پر دھمک دوں گا۔ میں غصے سے پاگل ہو رہا تھا پتھر تانے کھڑا تھا۔ اسی درمیان رشاد نہ جانے کدھر سے میرے پاس آ گیا۔ جیل کا اسٹاف ڈر کے مارے دور کھڑا تھا۔ رشاد اکثر جیل کے اندر کھیلنے آیا کرتا تھا۔ میرا بچہ للاّ رشاد سے کچھ ہی چھوٹا ہے۔ للاّ کی یاد مجھے جیل میں آیا کرتی تھی۔ رشاد کو دیکھتا تو مجھے للاّ یاد آ جاتا۔ میں رشاد کو لبھانے لگا۔ اکثر میں سب سے الگ تھلگ منٹوں رشاد کو چھاتی سے لگائے کھڑا رہتا تھا وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ اچھا تو وہ میرے پاس آیا اور ایسے بھولے پن سے باتیں کیں کہ میرا دل پگھل گیا۔ دیکھئے تو اب بیٹھا مسکرا رہا ہے۔ اُس دن مجھے نصیحت کر رہا تھا۔ بڑا مولوی بن کر گیا تھا۔ کہہ رہا تھا مجھ سے کہ بُری بات۔ کھانے سے انکار نہیں کرتے۔ اس نے بار بار پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیا۔ گھر میں اس کے سامنے جو نصیحت کی جاتی ہے اور جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اس کے سامنے آتی بس یوں سمجھئے کہ اس دن اس نے اس کی کاپی بڑے بھولے پن سے کی۔ میں نے پتھر پھینک دیا اور اسے سینے سے چمٹا لیا۔ کیوں میاں رشاد یاد ہے! تم نے مجھے اُس دن کیلا کھلایا تھا۔ ارے بھئی شرماتے کیوں ہو۔ فخر کرو میاں! تمہارے بچپنے کے معصوم بولوں نے میرے دل پر جو اثر کیا تھا وہ رنگ لا کر رہا۔"

اسلام الدین یہاں تک کہہ سکے تھے کہ اندر سے رضیہ آئی اور اس نے رشاد کے کان میں کچھ کہا۔ رشاد اٹھ کر اندر چلا گیا۔ وہاں اسلام الدین صاحب کی بیوی قانتہ نے اُسے بلا کر سینے سے لگا لیا، اس کی بلائیں لیں اور پاس ہی بٹھا لیا اور پھر اسلام الدین صاحب

کی آپ بیتی سننے لگیں۔ اسلام الدین صاحب کہہ رہے تھے۔

اس کے بعد گھبرائے ہوئے حولدار صاحب آپ پہنچے شاید آپ یوں گھبرائے ہوئے تھے کہ کہیں میں غصے میں رشاد کو پتھر سے پیس نہ دوں! آپ نے مجھے نصیحت کی تھی خیر اُس دن تو معاملہ رفع دفع ہوگیا لیکن ہم قیدی عام ہڑتال کی سوچنے لگے۔ اسی زمانے میں آپ نے چھوٹی بڑی سرکاروں کی مثال دے کر خدائی قانون کی طرف متوجہ کیا۔ آپ کو یاد تو ہوگا۔ آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ جس طرح جیلر کا حکم کانگریسی سرکار کے سامنے نہیں ماننا چاہیئے۔ اسی طرح اپنی زندگی کو انسانیت کے سانچے میں ڈھالنے کیلئے سب سے بڑی سرکار یعنی اللہ تعالیٰ کی سلطنت میں انسانوں کی بنائی ہوئی سرکاروں کے قانون کو حق نہ ماننا چاہیئے۔ بات کچھ اس طرح کہی گئی تھی کہ میں متوجہ ہوگیا۔ میں نے حولدار صاحب سے پوچھا۔ "حضور! خدائی قانون کا پتہ بتایئے تو ان کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمایئے۔ آگ تو لگادی اب دور کھڑے ہوکر تماشہ دیکھنے لگے۔ مجھ سے کہا کہ خدائی قانون خود ہی تلاش کرلو۔

اچھا بھئی، خود ہی تلاش کرلوں گا۔ میں نے دل ہی دل میں جھنجھلا کر کہا۔ اس کے بعد ان سے اور جیلر سے ٹھن گئی۔ یہ ماتحت وہ افسر۔ چٹان چھوٹی سی اینٹ پر گری تو اس نے پیس کر رکھ دیا۔ اس نے رپورٹ کر دی۔ ان کا تبادلہ ٹہری گڑھوال ہوگیا۔ پھر مجھے ان کا پتہ نہ چلا۔ رشاد کا آنا جیل میں بند ہوگیا۔

میں سوچ میں رہنے لگا۔ میں نے اپنے مزاج کو بدلنے کی کوشش کی۔ شرما جی جب تبدیل ہوکر ترویدی کی جگہ آئے تو انہوں نے میرے متعلق بڑی اچھی رپورٹ بھیجی۔ ان کی رپورٹ کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں دو سال کے بعد ہی رہا کر دیا گیا۔ میں اپنے گاؤں میں گیا تو اب میں بالکل بدلا ہوا تھا۔ کانتا جواب ماشاءاللہ قانتہ ہے۔ مجھ سے پوچھا کرتی کہ چپ چپ کیوں ہو۔ میں اُسے کیا بتاتا۔ کیوں چپ ہوں۔ میں جو چاہتا

تھا مل جاتا تو کچھ کہتا۔ میں نے بہت کچھ سوچ کر دل میں یہ طے کیا کہ مسلمانوں سے مل کر تبادلہ خیال کرنا چاہیئے۔

میرے گاؤں کے پاس نور پور ایک گاؤں ہے۔ اس میں مسلمان اچھی خاصی تعداد میں رہتے ہیں۔ ایک مسجد بھی ہے۔ مکتب بھی چل رہا ہے مکتب کا اُستاد ہی مسجد کا مُلاّ ہے۔ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ میں جا کر اُس سے ملا تو اُس نے ایک کتاب دی۔ کتاب کا نام تھا "اسلامی قانون" اسلامی قانون کی شروع کی عبارت یوں ہے۔

یہ دنیا خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ یہ دنیا خدا کی ہے۔ وہی اس کا بادشاہ ہے حکم چلانا اسی کا حق ہے اور اس کا حکم زمین اور آسمانوں میں چل رہا ہے۔ یہ زمین جو اس حاکم کی کا ایک حصہ ہے اس پر بھی اسی کا حکم چلنا چاہیئے۔

بہر حال مجھے یہ عبارت زبانی یاد ہے۔ میں نے بڑے شوق سے کتاب پڑھی۔ اس کے بعد مجھے اسلامی باتیں جاننے کا جو چسکا لگا تو میں نے رات دن ایک کر دیا۔ سات آٹھ کوس روز چل کر جاتا آتا۔ جتنا لٹریچر مجھے مل سکا میں نے اُسے گھول کر جی ہاں، گھول کر ہی پی لیا گویا اب آگے بڑھنے کے لیے مجھے چاہیئے تھا۔ تو ملاّ صاحب نے کہا کہ یوں تو پڑھنے کو بہت کچھ لکھا ہوا موجود ہے کہاں تک پڑھو گے۔ زیادہ اچھا یہ ہے کہ وہ کتاب پڑھو جس سے یہ ساری کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ میں نے پوچھا "کون سی کتاب" انہوں نے قرآن شریف کا نام لیا اور میں نے ان سے کہا "منگا دیجئے"

قرآن شریف با ترجمہ آگیا تو میں نے ایک کوشش اور کی میں نے عربی پڑھنے کا شوق ظاہر کیا۔ اللہ تعالیٰ ملاّ صاحب کو دونوں جہاں میں سُرخرو فرمائے۔ انہوں نے بھی میرے ساتھ خوب محنت کی۔ چھ مہینے میں قرآن مجید ناظرہ پڑھنا سکھا دیا اب میں تھا اور قرآن مجید۔ لیکن یہ سب نور پور میں ہوتا۔ ابھی میں نے کانتا (فاطمہ) اور آشا (عائشہ) سے کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیکن میرے اندر جو تبدیلی ہو رہی تھی۔ یہ دونوں محسوس کر رہی تھیں۔ آخر کانتا پیچھے پڑ گئی۔ میں نے

بڑی احتیاط کے ساتھ ایک بات اس کے سامنے رکھی۔ آشا بھی سنتی تھی۔ آشا زیادہ ذہین ہے۔ کانتا تو میری پہلی نالائقیوں کی وجہ سے وقت سے پہلے بوڑھیا ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں کم آتا لیکن...."

اچانک کھڑکی کے دوسری طرف عورتوں کے ہنسنے کی آواز نے مردانے کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اسی لمحہ کے بعد رضیہ آئینہ لیے ہوئے کمرے میں آئی اور اسلام الدین صاحب سے کہنے لگی کہ چچی جان (قانتہ) نے یہ آئینہ دیا ہے اور فرمایا ہے کہ ذرا اس میں اپنی صورت دیکھ لیجیے۔

یہ پھبتی کچھ ایسی بر وقت تھی کہ مردوں کو بھی مزہ آگیا۔ کمرے میں ایک قہقہہ بلند ہوا۔ اسلام الدین صاحب بھی ہنس پڑے اسی وقت رشاد چائے لے کر آیا۔ ضمیر صاحب نے کہا کہ چائے پیتے جائیے اور کہانی سناتے جائیے۔ کہانی اتنی دلچسپ تھی کہ چائے کے دوران اُسے بند کر دینا کسی کو مناسب معلوم نہیں ہوا۔ چنانچہ اسلام الدین صاحب نے سب سے پہلے ایک پیالی پی اور پھر کہنے لگے۔

قصہ مختصر یہ کہ سال ڈیڑھ سال اور لگا۔ اس طرح تقریباً پانچ چھ سال لگ گئے۔ میں اسلام پر بالکل مطمئن ہو گیا۔ تو کانتا نے رائے دی کہ اب باقاعدہ مسلمان ہو جانا چاہیئے۔ لیکن میرے سامنے چند خطرے تھے۔ قانتہ کیا جانے۔ میں مرد آدمی جانتا تھا۔ دیکھتا تھا کہ جو لوگ مسلمان ہو گئے ان کو سماج میں برداشت نہیں کیا گیا۔ میں چاہتا تھا کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے چنانچہ میں نے قانتہ سے مشورہ کر کے سب سے پہلے للاّ کو کلکتہ روانہ کیا۔ اللہ کا فضل تھا کہ میں نے للاّ کے بارے میں حولدار صاحب سے مشورہ طلب کیا۔ میں نے پورے حالات لکھ کر ان کے پاس بھیجے۔ کئی مہینوں کے بعد جواب ملا۔ اس خط سے مجھے معلوم ہوا کہ حولدار صاحب کا تبادلہ کہاں سے کہاں ہوا۔ اور پھر وہ معطل ہو گئے۔ میرا لفافہ ان کا پیچھا کرتا رہا آخر انہیں پا لیا۔ انہوں نے آپ سے

(ضمیر صاحب) سے مشورہ کیا۔ خدا کی قدرت شانتی نکیتن میں ڈاکٹر احمد صاحب ان کے آدمی نکل آئے۔ آپ صاحبان کا جواب ملا تو للاّ کا مسئلہ آسانی سے حل ہو گیا۔ اب مجھے چارج شیٹ ختم کرانا ہی تھی۔ زمین بیچنا تھی۔ اللہ کے فضل سے یہ سب بھی ہو گیا۔ اب سوچا کہ دہلی چل کر جامع مسجد میں اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرنا چاہیئے۔ اور وہیں سے چپکے آپ صاحبان کے پاس چلے آنا چاہیئے۔ فرقہ پرستوں کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ورنہ وہ خدا جانے کیا اُدھم مچائیں۔ اسی اندیشے سے میں نے آشا کی جنم پتری نکلوائی تاکہ اُدھم مچانے والے اُسے نابالغ کہہ کر ہم سے علیحدہ نہ کر دیں۔ بہرحال ہم نے اپنی عقل کے مطابق سارے اندیشوں کے دروازے بند کر دیئے تھے مگر اللہ تعالیٰ ہمارا امتحان لینا چاہتا تھا۔ اس نے ہمارا امتحان لیا۔ اور پھر اسی نے اپنی مہربانی سے اس میں کامیاب کیا۔ عائشہ نے راستے میں وہ جرأت دکھائی کہ ہم مردوں سے ممکن نہیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم آپ مل کر بیٹھے۔ یہاں آکر ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے ہم ——— اپنے خاندان کے اپنے بھائیوں میں آ گئے۔ قانتہ اور عائشہ یہی کہہ رہی ہیں اور اب آپ جو کچھ مشورے دیں گے خدا نے چاہا تو ہم سب اس پر عمل کریں گے۔ میری ایک تمنا ہے کہ عائشہ کو میں اسلامی تعلیم سے اس قابل بنا دوں کہ اسے دیکھ کر لوگ کہہ سکیں کہ ہاں یہ ہے مسلمان عورت۔ اس کام میں اپنی ساری کمائی لگانے کو تیار ہوں۔ بہرحال اب میری سب سے بڑی یہی تمنا ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ صاحبان کی مدد سے میری تمنا پوری ہو گی۔

یہ کہہ کر اسلام الدین صاحب خاموش ہو گئے۔ ان کے خاموش ہوتے ہی انشاءاللہ سب کی زبان سے نکلا اور غور و خوض کرنے کیلئے دوسرا ٹائم مقرر کر کے سب اٹھ گئے۔

سب سے بڑا امتحان

اسلام الدین صاحب کے آجانے سے ضمیر صاحب اور حولدار صاحب اور ان کے گھر والوں کی دلچسپی ان نو واردوں سے بڑھ گئی جو محض اللہ کیلئے اپنا گھر بار خاندان اور وطن چھوڑ کر یہاں چلے آئے تھے۔ ضمیر صاحب اور حولدار صاحب اسلام الدین صاحب سے ان کے گذشتہ حالات سنتے اور آئندہ کیلئے منصوبے بناتے۔ باتوں باتوں میں ضمیر صاحب اور حولدار صاحب نے محسوس کرلیا کہ اسلام الدین صاحب کو اب جو فکر خاص ہے وہ ہے عائشہ کی دینی تعلیم اور اس کی شادی کی۔ انہیں اطمینان دلایا گیا کہ زیادہ فکرمند نہ ہوں۔ جس اللہ نے یہاں تک پہنچایا ہے وہی آئندہ بھی مالک ہے۔

ادھر گھر میں ملانی بی اور مریم نے قانتہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کی خاطر و مدارات اور دلجمعی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اسے سہیلی اور بہن بنا کر رکھا اور اپنے دو کے بجائے تین ہونے پر بار بار اظہارِ مسرت کیا اپنے برتاؤ سے قانتہ کو ہر طرح مطمئن کر دیا کہ وہ یہاں امن

و آشتی سے رہے گی اور ہم سب دامے درمے قدمے سخنے اس کی مدد کیلئے تیار رہیں۔ قانتہ سے بے تکلفی ہونے پر ملّانی بی اور مریم نے بھی محسوس کیا کہ اسے سب سے بڑی فکر عائشہ کی شادی کی ہے۔

اے بہن! کل تو آئی ہو، اتنی جلدی بیٹی کو دفعان کرنا چاہتی ہو"، مریم نے ایک دن چھیڑا۔

نہیں بہن! دفعان کرنا کون ماں چاہتی ہوگی۔ لیکن زمانے کی ریت یہی چلی آرہی ہے۔ اور پھر میں نے سنا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید بھی فرمائی ہے کہ بالغ ہونے کے بعد اولاد کی شادی جلد سے جلد کر دینا چاہیے ورنہ اگر اس سے کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی۔ تو اللہ تعالیٰ والدین کو بھی پکڑے گا۔ بس اسی لیے میں پریشان ہوں۔

مریم نے تو چھیڑا تھا مگر قانتہ کی گفتگو نے سنجیدگی پیدا کر دی۔ اس کی دونوں منھ بولی بہنوں نے اس کی ڈھارس بندھائی اور وعدہ کیا کہ اپنے اپنے میاں سے کہہ کر جلد ہی کہیں نسبت طے کرا دیں گی۔

مردوں اور عورتوں میں یہ منصوبے زیر بحث تھے۔ اب رہے بچے تو رشاد اور رضیہ جب پڑھنے سے فرصت پاتے عائشہ کے پاس پہنچ جاتے اسی کے پاس گھسے رہتے۔ اُسے نبیوں کے قصے اور ایسی کہانیاں سناتے جو اپنے والدین سے سُن چکے تھے۔ اس سے بھی کہانیاں سنتے۔ عائشہ جو کہانیاں کہتی، وہ ان بچوں کیلئے انوکھی کہانیاں ہوتیں وہ ڈاکوؤں چوروں اور اچھے برے راجاؤں کی کہانیاں سناتی۔ دیوی دیوتاؤں کی داستانیں سُنا کر بتاتی کہ انہی قصوں کو ہندو سماج میں دینی حیثیت حاصل ہے۔ عائشہ نے رشاد کی تعلیم کو ٹٹول لیا تھا اور اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ہندی میں کمزور ہے اس نے اپنے تفریحی اوقات میں آدھ گھنٹہ، رشاد اور رضیہ کو ہندی پڑھانے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس کی اس توجہ نے اُسے رشاد اور رضیہ کی نظروں میں تھوڑے ہی دنوں کے اندر "عائشہ باجی" بنا دیا دونوں

بچوں کی عائشہ باجی نے محنت کر کے انہیں ہندی میں رواں کر دیا۔ رشاد نے اپنے اسکول کے دوسرے طالب علموں کو سامنے رکھ کر اپنے کو تولا تو اس نے محسوس کرلیا کہ اگر عائشہ باجی کی توجہ اسی طرح رہی تو سالانہ امتحان تک اس کمی کو پورا کرلے گا۔ اسی مضمون کی طرف سے اُسے اندیشہ تھا۔ یہ کمی پوری دکھائی دی تو اب وہ پوزیشن بنانے کی کوشش میں لگ گیا۔

عائشہ کی اس توجہ نے دونوں گھروں کے سرپرستوں کو اس کی طرف متوجہ کر دیا ضمیر صاحب نے تو یہ بدلہ دیا کہ اپنے قیمتی اوقات میں سے ایک گھنٹہ نکالا اور اُسے اُردو اور قرآن پڑھانے کا ذمہ لے لیا۔ پڑھاتے وقت ان کے اور عائشہ کے درمیان صرف ایک کپڑا حجاب کے طور پر لٹکا دیا جاتا۔ اسلام الدین صاحب اور قانتہ نے اشاروں میں کہا بھی کہ آپ ہی کی لڑکی ہے۔ اس حجاب کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا جواب اسلام الدین صاحب اور ان کی بیوی کو دیا گیا تو ان کے دل میں اسلامی قدروں میں سے ایک اور قدر بڑھی۔ ضمیر صاحب نے جواب دیا۔

تعلقات کے اضافے اور اپنا سمجھنے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو پس پشت ڈال دیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پردے کا حکم دیا ہے تو پردہ ہونا چاہیئے اور اس میں ہمارے لیے ہی بھلائی ہے شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے وہ طرح طرح سے حملہ آور ہوتا ہے۔"

یہ سُن کر اسلام الدین صاحب اور قانتہ کے دل میں اسلامی اصول و نظریات کی عظمت بڑھنے کے ساتھ ضمیر صاحب کی عزت بھی بڑھی۔ دونوں اپنی خوش نصیبی پر اللہ کا شکر ادا کرنے لگے کہ اس نے اندھیرے سے نکال کر کیسے اُجالے میں پہنچا دیا۔

رشاد عائشہ سے ہندی تو پڑھ ہی رہا تھا۔ ایک دن ریاضی کے ایک سوال میں اُلجھ جانے کی وجہ سے وہ ہندی کا سبق ٹھیک نہ سنا سکا تو عائشہ نے اس سے وجہ پوچھی اس نے اپنی اُلجھن بتائی تو عائشہ نے کہا "لاؤ، میں دیکھوں کیسا سوال ہے؟" اور جب رشاد نے سوال اس کے سامنے رکھا اور اُس نے اپنے ذہن پر زور دیا تو اصول اس کی سمجھ

میں آگیا اور اس نے جواب نکال کر دکھایا۔ اب تو رشاد بہت خوش ہوا اور پھر جب اسی طرح اس کی عائشہ باجی نے جامیٹری کا ایک مسئلہ سمجھا دیا تو رشاد نے کہا " باجی! آپ بھی امتحان میں کیوں نہ شریک ہو جائیں۔ آپ تو بڑی آسانی سے پاس کر لیں گی۔

یہ سن کر عائشہ مسکرائی۔ اس نے کہا " اپنے ابّا سے کہو جیسا وہ فرمائیں گے ویسا کروں گی۔"

رشاد نے اسی دن حولدار صاحب سے کہا اور حولدار صاحب نے ضمیر صاحب کے سامنے یہ مسئلہ پیش کر دیا۔ ضمیر صاحب نے کہا کہ امتحان میں شریک ہونے کے لیے آٹھویں کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت پڑے گی۔ آٹھویں کلاس کا سرٹیفکیٹ اگر عائشہ کی طرف سے اول تو پیش ہونا مشکل ہے کیونکہ جونیر ہائی اسکول چھوڑے ہوئے اُسے عرصہ ہو گیا یہاں سے اب وہاں درخواست بھیجی جائے۔ وہاں سے سرٹیفکیٹ آئے نہ آئے۔

اچھا فرض کر لیجیے کہ آ جائے گا تو کس نام سے؟ آشا کے نام سے ہی تو! اب ہم اخباروں میں ان سب کے مسلمان ہونے کا تین بار اعلان کریں، پھر اخبار کی کٹنگ لے کر مجسٹریٹ سے نئے ناموں کی منظوری لیں تو کام چلے۔ کون اس جھکھیڑ میں پڑے پھر مجھے اس میں دوسری نزاکتیں بھی نظر آتی ہیں۔ معاملہ ہنوز دبا ہوا ہے۔ یہاں کون جانتا ہے کہ ہمارے ساتھ کچھ نومسلم رہ رہے ہیں۔ اب ہم وہ مثل کریں کہ آ بیل مجھے مار۔ یاد ہے آپ کو ملک تھانے پر کپتان پولیس نے آپ سے کہا تھا۔ آپ نے ہی مجھے بتایا تھا کہ جب وہ آپ کو الگ لے گیا تو کہا تھا کہ اس معاملے کو خاموشی سے ٹال دیجیے۔ اور میری صوابدید پر چھوڑ دیجیے۔ میں جو چاہوں کروں۔ اس کے فائدے بتاتے ہوئے کپتان نے یہ بھی کہا تھا کہ بریلی فرقہ پرستوں کا گڑھ ہے۔ کیا ضرورت ہے کہ وہاں لوگوں کو معلوم ہو۔"

" خوب یاد دلایا آپ نے۔ یہ نزاکت تو ہے۔" حولدار صاحب نے ضمیر صاحب کے حافظے اور سوجھ بوجھ کی داد دی پھر مسکرا کر کہنے لگے۔ آپ کے سامنے ایک راز کی بات نہیں آئی

ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں۔

"فرمایئے!"

ایک دن باتوں باتوں مریم نے عائشہ کی شادی کے بارے میں اس کی ماں سے تذکرہ کیا تو عائشہ کی ماں نے کہا "میں کیا جانوں۔ حولدار صاحب اور ضمیر صاحب جیسے سرپرستوں کے ہوتے ہوئے اب مجھے کیوں فکر ہو؟ اس کے بعد کیا ہے وہ شعر! خوب ہے کہ!

حرفِ مطلب زباں سے نکلا
دل کا کانٹا زبان سے نکلا

ہاں تو اس کے بعد دل کی بات بتائی کہ اگر ڈاکٹر احمد صاحب کے ساتھ عائشہ کی شادی ہو جاتی تو بڑا اچھا ہوتا۔"

اچھا تو اتنی دور کی آپ لوگ سوچ رہے ہیں اور شاید اسی لیے عائشہ سے ہائی اسکول کا امتحان دلانا چاہتے ہیں تاکہ وہ آج کل کے ذوق کے مطابق نوجوانوں کے ساتھ شادی کرنے کے لائق ہو جائے جو سند یافتہ بیوی چاہتے ہیں لیکن میں آپ کو بتاؤں۔ ڈاکٹر احمد صاحب ایسے نہیں ہیں۔ اگر ان کو ایسی بیوی کی ضرورت ہوتی تو وہیں شانتی نکیتن میں ٹیگور خاندان کی ایک تعلیم یافتہ ایم۔ اے پاس لڑکی سے شادی کر لیتے۔ لڑکی اور لڑکی کے والدین نے بہت چاہا کہ سول میرج کر لیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب تیار نہ ہوئے میں آپ کو بتاؤں۔ ڈاکٹر صاحب ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں جو سب سے بڑے امتحان میں پاس ہونے کی تیاری کر رہی ہو۔"

سب سے بڑا امتحان کون سا؟ یعنی ریسرچ وغیرہ جیسے ڈاکٹر صاحب خود ہیں۔ تو بھائی یہ بات ہمارے بس کی نہیں۔ میں آج ہی مریم سے کہدوں گا کہ عائشہ کے لیے ڈاکٹر صاحب کا خیال دل سے نکال دو۔ خدا چاہے گا تو یہیں بر تلاش کر لیا جائے گا۔"

حولدار صاحب! آپ نے مجھے پوری بات کہنے نہیں دی۔ اور نہ جانے کہاں پہنچ

گئے"۔ سب سے بڑے امتحان کا مطلب یہ ہے کہ جس امتحان میں پاس ہونے کے بعد انسان کو سب سے بڑا اونچا درجہ ملے۔ یعنی وہ امتحان ہے ہماری یہ زندگی جس کا نتیجہ آخرت میں سامنے آئے گا۔ وہاں سب کے پرچے دیکھیں جائیں گے۔ نمبر ملیں گے جو پاس ہوگا جنت میں جائے گا جو فیل ہوگا وہ جہنم میں۔ تو بھائی! عائشہ کو اس امتحان کی تیاری کراؤ۔ رہا ڈاکٹر صاحب سے اس کی شادی کا مسئلہ، تو مجھے تو اچھا خاصہ جوڑ معلوم ہوتا ہے عمر، شکل وصورت، طور طریقہ، ڈھنگ اور سلیقہ، عائشہ میں کمی ہی کیا ہے کہ نا امید ہوا جائے۔ وہ سالانہ تعطیل میں آنے والے ہی ہیں۔ میں خود چھیڑوں گا۔ کوشش کرنا ہمارا کام ہے اور کام بنانا خدا کے بس میں ہے اللہ تعالیٰ نے جہاں جوڑا لکھا ہوگا وہیں ہوگا"۔

ضمیر صاحب کی سوجھ بوجھ اور اثر و رسوخ کے حولدار صاحب دل ہی دل میں اس درجہ قائل تھے کہ انہوں نے اس طرح ان سے باتیں کیں تو حولدار صاحب نے یقین کر لیا اور جا کر مریم سے کہہ بھی دیا کہ انشاء اللہ اسلام الدین صاحب اور قانتہ کی مراد پوری ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ سب سے بڑے امتحان والی دلچسپ لیکن ایمان افروز بات بتا کر کہا کہ ضمیر صاحب ہر معاملے کو خوب سوچتے ہیں۔ پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ عائشہ امتحان پاس کر لے۔ امتحان کا شوق لڑکوں کے اندر سارے مضامین کو کھنگال ڈالنے کا ذوق پیدا کر دیتا ہے میں چاہتا ہوں کہ عائشہ ایک نظر سارے مضامین پر ڈالے۔ آخر ہم ایک نسواں اسکول قائم کرنا چاہتے ہیں ہیں۔ شاید اس کیلئے اس کی خدمات حاصل کر سکیں۔

"آپ بھی خوب ہیں"۔ مریم نے چھیڑا۔ ڈاکٹر صاحب سے شادی ہو جانے کے بعد وہ اسے لے جائیں گے یا وہ یہاں اسلامیہ نسواں اسکول کیلئے بیٹھی رہے گی"۔

بہر حال میری رائے یہی ہے کہ وہ امتحان پاس کر لے۔ اس سے کہو کہ تیاری کرے۔ میں داخلے کے وقت تک ضمیر صاحب کو راضی کر لوں گا۔ رشاد کہتا تھا کہ اس کی عائشہ باجی اول نمبر سے کم نہیں آئیں گی۔ بات یہ ہے رشاد کی ماں ۱۸۵۷ء سے پہلے تعلیم پھر

بھی غنیمت تھی۔ اب تو بالکل چوپٹ ہے اور عائشہ اسی زمانے کی پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ آج کل ہائی اسکول کی تعلیم کا جو معیار ہے اس وقت کے مڈل اسکول سے بس اتنا زیادہ ہے کہ کچھ انگریزی شامل کردی گئی ہے۔ بس تو عائشہ کو پاس کرنے میں کیا دقت پڑے گی۔ رہا آٹھویں کا سرٹیفکٹ تو ضمیر صاحب اگر پرنسپل صاحب سے کہہ دیں گے تو وہ اپنے اسکول سے نہیں تو پرائیوٹ کسی نہ کسی طرح شریک امتحان کروا ہی دیں گے۔ لیکن دیکھو رشاد کی ماں شادی کے بارے میں اگر کوئی بات آئے تو یہ یقین نہ دلانا کہ ڈاکٹر صاحب سے شادی ہو ہی جائے گی۔ ہاں یہ کہہ دینا کہ ہم لوگ کوشش کریں گے سمجھیں!"

"ہاں سمجھ گئی۔ میں تو ابھی جاکر ملّانی بی سے کہتی ہوں کہ جہیز کی تیاری کریں۔ میرے حولدار نے عائشہ کی شادی ڈاکٹر احمد سے طے کردی۔

مریم کے یہ کہنے سے حولدار صاحب ہنسنے لگے۔ اتنے میں سامنے سے رشاد آتا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ عائشہ تھی۔ عائشہ نے حولدار صاحب کو سامنے دیکھا تو نقاب ڈال لیا۔ پھر سلام کرکے اپنی چچی جان (مریم) کے پاس جا بیٹھی۔

"رشاد میاں! تم اپنی باجی کو اس وقت کسی غرض سے لائے ہو یا محض تفریح کے لیے۔"

"ابو میاں! میں نے عائشہ باجی کو امتحان دینے کیلئے رضامند کرلیا ہے۔ آپ بتلائیے۔ آپ کی کیا رائے ہے۔"

"کیا کرے گی ہائی اسکول کرکے۔"

کیا کریں گی۔ اور میں کیا کروں گا۔ مجھے بھی تو آپ ہائی اسکول کروا رہے ہیں۔"

حولدار صاحب کو رشاد کے اس جواب کا جواب نہ سوجھا انھوں نے کہا۔

"رشاد میاں! میں چاہتا ہوں کہ تم سب سے بڑے امتحان کی تیاری شروع کردو۔"

ابو میاں! پہلے یہ چھوٹے چھوٹے امتحان پاس کیے جائیں گے۔ تب ہی تو بڑے امتحان میں داخلے کی اجازت ملے گی۔ پہلے یہ امتحان پھر انٹر، پھر بی اے پھر ایم اے پھر اور پھر اور ......"

"اس کے بعد رشاد میاں!"

ابو میاں پھر کیا؟ آپ شاید ایک دن یہ بتا رہے تھے کہ مجھے کسی بڑے مولانا صاحب کی خدمت میں عربی پڑھنے کیلئے بھیجیں گے۔

"میاں! ایک اور سب سے بڑا امتحان ہے۔"

"اور کون سا سب سے بڑا امتحان۔ پی ایچ ڈی؟"

"اور اس سے بھی بڑا۔"

"اس سے بھی بڑا؟ ابو جان! آپ تو آج پہیلی بجھوا رہے ہیں۔ بتا بھی دیجئے۔"

بھئی ہماری یہ زندگی بھی تو ایک امتحان ہے۔ اس کا رزلٹ آخرت میں آؤٹ ہوگا۔ اس کے بعد وہاں دو درجے ہیں ایک درجہ ہے جنت جہاں سکھ ہی سکھ ہوگا۔ وہاں جو پاس ہوگا اس کیلئے یہ درجہ ہے اور وہاں فیل ہونے والے کیلئے دوسرا درجہ جہنم ہے۔ سمجھے تم؟"

جی ابو میاں سمجھا۔ ایک دن چچا میاں یہ بھی کہہ رہے تھے کہ دنیاوی امتحانات کے پرچے پہلے سے بتائے نہیں جاتے لیکن زندگی میں ہم جو امتحان دے رہے ہیں۔ اس کا پرچہ آؤٹ ہو چکا ہے سب کو بتا دیا گیا ہے کہ آخرت میں یہ اور یہ

اچھا تو پھر جاؤ۔ تم سب اس امتحان کی سب سے زیادہ فکر کرو۔ رہ گئے یہ دنیاوی امتحانات تو میں عائشہ کے لیے کوشش کروں گا۔ اور دیکھو بیٹی عائشہ تم رشاد کے ساتھ تیاری شروع کر دو۔"

یہ سن کر عائشہ بہت خوش ہوئی۔ اس دن وہ دن بھر یہیں رہی۔ مریم نے اس سے کہا "عائشہ بیٹی! آج تمہارا ایک امتحان میں لینا چاہتی ہوں یہ دیکھو جنس

رکھی ہے اور یہ دیکھو مسالہ ۔ آج تم کھانا پکاؤ اور دیکھو آج سب لوگ یہیں تمہارا پکایا ہوا کھائیں گے ۔ میں رضیہ کی ماں سے کہنے جا رہی ہوں ۔ میں رضیہ کو ساتھ لیتی آؤں گی ۔ وہ تمہاری مدد کرے گی ۔"

خوشی میں خوشی

"میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آج کل مجھے رشاد اور عائشہ کے پاس ہونے کی زیادہ خوشی ہے یا ڈاکٹر احمد صاحب اور لعل احمد سلمہ، کے آنے کی؟" ضمیر صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں سلسلۂ گفتگو شروع کیا۔

"ضمیر صاحب! آپ نے تو میرے دل کی بات چھین لی۔ واقعی میں بھی یہی سوچتا ہوں۔ ایک طرف تو رشاد نے امتیازی نمبر حاصل کر کے فرسٹ پوزیشن حاصل کی اور عائشہ کم وقت میں پرائیوٹ طور پر تیاری کر کے سکنڈ ڈویزن آئی۔ یہ اس کی ذہانت اور محنت کا ثبوت ہے۔ دوسری طرف ڈاکٹر صاحب کا تشریف لانا اور لعل کا ایک مدت کے بعد اپنے بچھڑے ہوؤں سے ملنا۔ خوشی بالائے خوشی۔ کیوں اسلام الدین صاحب! کیا خیال ہے آپ کا؟"

"راشد بھائی! میں اپنی خوشی کا اظہار نہیں کر سکتا۔ میرے پاس الفاظ

نہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر سکوں۔ یہی حال عائشہ اور اس کی والدہ کا ہے دونوں بار بار سجدے میں گر جاتی ہیں۔ اور اللہ کا شکر ادا کرنے سے نہیں تھکتیں میرے دل سے ان سب کے لیے دعا نکل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو دونوں جہاں میں سرخرو فرمائے۔ میں ڈاکٹر صاحب کو دعاؤں کے سوا اور کیا بدلہ دے سکتا ہوں۔

"بے شک یہ عجیب حسن اتفاق ہے۔ ابھی ہم رشاد اور عائشہ کی کامیابی پر خوش ہو رہے تھے کہ ہمارے عزیز مہمان ڈاکٹر صاحب لعل کو لے کر آ گئے میں خصوصیت سے اسلام الدین صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔"

"سچ فرمایا آپ نے! اس وقت ہم سب میں سب سے زیادہ مبارکباد کے مستحق اسلام الدین صاحب ہیں۔ اسلام الدین صاحب، اور ان کی اہلیہ نے اس موقع پر جس طرح اپنی دلی خوشی اور مسرت کا اظہار کیا۔ یہ انہی کا حصہ ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک سال کے بعد اپنے للآ جو اب لعل احمد ہے اس سے ملے اور لعل کے تعلق سے ڈاکٹر صاحب کے بے حد ممنون ہیں۔ لیکن میں نے جہاں تک اندازہ لگایا ہے، کہہ سکتا ہوں کہ یہ ان کی فطری عادت ہے ایک زمانہ وہ تھا کہ وہ اپنے جوار میں رئیس تھے۔ کشادہ دل اور روشن خیال رئیس۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے (میں اس حدیث کا مفہوم پیش کرتا ہوں) کہ تم میں جو اسلام لانے سے پہلے اچھا تھا وہ اب بھی اچھا ہے۔ حضورؐ کا یہ ارشاد اسلام الدین صاحب پر صادق آتا ہے۔ کیا خیال ہے ڈاکٹر صاحب!"

بے شک میں اسلام الدین صاحب کی مہمان نوازی اور ان کی محبت سے بہت متاثر ہوں۔ موصوف کے ذہن کو میں نے اسی وقت پڑھ لیا تھا جب وہ کلکتہ تشریف لے گئے تھے۔ اور یہ جو ممنون ہونے والی بات آپ نے فرمائی تو اس میں میں نے کیا کیا۔ آپ کے گرامی نامہ کی تعمیل کرنا میرا فرض تھا۔ میں نے اپنا فرض انجام دیا میں تو اس سے بہت خوش ہوا کہ وہاں تنہا تھا۔ للآ آ گیا۔ اس کے آنے سے۔ مجھے وہ لطف

حاصل ہوا جو لطف ایک بچے کو کھلونا پاکر حاصل ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہم سب ایک دوسرے کے ممنون ہونے کے بجائے اللہ کے شکر گذار ہوں۔"

بات تو یہی ہے جو آپ فرما رہے ہیں لیکن میں عرض کردوں۔ میں نے بھی کچھ سمجھ کر آپ کے سپرد کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا آپ نے لعل کو ایک سال کے اندر خوب تربیت دی۔ رشاد دوسرے لڑکوں سے بہت کم مانوس ہوتا ہے لیکن لعل سے ایسا ہل مل گیا ہے جیسے وہ اس کا بھائی ہو۔"

جیسے وہ اس کا بھائی ہو۔ یہ کیا فرمایا آپ نے! کیا آپ لعل کو اپنا بیٹا نہیں سمجھتے۔ میں تو آپ کو اپنے سگے بھائی سے زیادہ سمجھتا ہوں۔"

اسلام الدین صاحب! آپ کو واقعہ سناؤں۔ چند سال پیشتر میرے حقیقی بھتیجے اور بھتیجیاں آئی ہوئی تھیں۔ ان کے طور طریقوں سے رشاد ایک ہفتہ کے اندر ہی بیزار ہو گیا تھا۔ غور فرمائیے۔ اس کا بھولا پن۔ احمق ایک دن اپنی ماں سے کہنے لگا۔"یہ سب کب لکھنؤ جائیں گے لیکن کل رات مجھ سے یہی رشاد ضد کر رہا تھا کہ لعل کے ساتھ کلکتہ جاؤں گا اور اب ڈاکٹر صاحب ہی کے پاس رہ کر پڑھوں گا۔ اس سے آپ سمجھ لیجئے جو میں نے عرض کیا۔"

خیر اس پر مشورہ پھر ہو جائے گا۔ ہمیں اب یہ بھی سوچنا ہے کہ رشاد کو تعلیم جاری رکھنے کے لیے کہاں بھیجا جانا چاہیئے۔ اگر ڈاکٹر صاحب منظور فرمالیں گے تو وہاں ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ رشاد عربی تو آپ سے پڑھے گا اور موجودہ تعلیم شانتی نکیتن میں حاصل کرے گا۔ وہاں اُسے دیگر مذاہب کے مطالعہ کا موقع بھی خوب ملے گا۔ ان شاء اللہ ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی میں وہ کچھ بن کر رہے گا۔

ماشاءاللہ حسن تدبیر سے آپ نے کام لیا ضمیر صاحب! کہاں تو رشاد کے متعلق بعد میں مشورہ کرنے کی سوچ رہے تھے۔ کجا اس طرح خود مشورہ دیا کہ ڈاکٹر صاحب منظور

ہی منظور کرلیں۔

"ضمیر صاحب مجھ سے بے تکلف ضرور ہیں۔ لیکن میں عرض کروں۔ وہ میرے نہایت شفیق اُستاد اور مُربّی بھی ہیں۔ میرے لیے ان کا اشارہ کافی ہے۔ پھر رشاد جیسا بچہ اگر مجھے ملے تو یہ میری سعادت ہے۔"

یاران طریقت یعنی ضمیر صاحب، راشد علی خاں صاحب اور اسلام الدین صاحب میں یہ محبت آمیز باتیں ڈاکٹر صاحب کی صحبت میں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں لعل اندر سے دوڑتا ہوا آیا اس نے ڈاکٹر صاحب کے کان میں کچھ کہا اور اس طرح انہیں دیکھنے لگا جیسے اس نے ان سے کوئی جواب طلب کیا ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی طرف دیکھا۔ اور کہا "لعل! میرے دونوں میٹھے! جاؤ تم رشاد کے ساتھ کھیلو۔"

یہ جواب پاکر لعل قدرے تامل کے بعد کچھ سوچتا ہوا چلا گیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب سے پوچھا گیا کہ یہ کیسی سرگوشی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر بتایا۔ لعل اور رشاد میں یہ بحث چھڑی تھی کہ میں ان میں سے کسے زیادہ چاہتا ہوں۔ لعل مجھ سے یہی پوچھنے آیا تھا۔ اسی کا میں نے یہ جواب دیا۔"

کیا کہنا ڈاکٹر صاحب! سبحان اللہ! سبحان اللہ! کیا خوب جواب دیا آپ نے! اسے کہتے ہیں ذہن رسا۔ اور اسے کہتے ہیں حاضر جوابی۔ واہ واہ! جزاک اللہ، جزاک اللہ۔"

ڈاکٹر صاحب کے جواب پر سب کے سب جھوم گئے۔ ڈاکٹر صاحب کے دوست نسیم صاحب علیگ جو آج صبح شاہجہانپور سے ان کی ملاقات کو آئے تھے اور اس صحبت میں موجود تھے۔ تمام گفتگو سن رہے تھے اور نہایت خاموشی کے ساتھ محظوظ ہو رہے تھے اب انہیں موقع ملا۔ کہنے لگے:۔

"احمد صاحب! ہم تو اس وقت سے آپ کی برجستگی کے قائل ہیں جب علی گڑھ میں پڑھتے تھے اور یہ کہہ کر نسیم صاحب ضمیر صاحب کی طرف متوجہ ہوئے

کہنے لگے :-

"میں نے صرف تین یوم کی رخصت حاصل کی ہے - میں چاہتا ہوں کہ آپ نے جس خاص غرض کے لیے مجھے بلایا ہے اس پر مشورہ فرمالیں"

"کیا؟" ضمیر صاحب کے علاوہ ہر شخص نسیم صاحب کی طرف دیکھنے لگا اور پھر یکایک ہر ایک ضمیر صاحب کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ضمیر صاحب نے کسی قدر تامّل کے بعد فرمایا -

میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب میں اللہ تعالیٰ نے یہ ملکہ خاص طور سے ودیعت فرمایا ہے کہ اجنبی بچوں تک کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ بعل اس کی ایک مثال آپ کے سامنے ہے - آپ حضرات تقریباً ایک سال سے عائشہ کو بھی دیکھ رہے ہیں - اس کے طور طریقے، اس کے رنگ ڈھنگ اس کی سوجھ بوجھ' اس کی حیا و عزت نفس اس کی ذہانت وغیرہ سب آپ کے سامنے ہے - پھر رشاد کو ہندی میں مدد دے کر اس نے جس طرح فرسٹ پوزیشن کے لائق بنایا - یہ اسی کا حصہ تھا ورنہ رشاد ہرگز امتیازی نمبر حاصل نہیں کرسکتا تھا - اکثر وہ کہا کرتا تھا کہ میری ہندی کمزور ہے ورنہ میرا مقابلہ پرنسپل صاحب کا لڑکا بھی نہ کرپاتا -

آپ صاحبان بے چین ہو رہے ہیں نفس مطلب کے لیے - میں عرض کرتا ہوں - میں نے نسیم صاحب کو خاص طور سے اس لیے بلایا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی خانہ آبادی کے لیے ان سے مشورہ کروں - میں نے نسیم صاحب کے سامنے یہ مسئلہ رکھا - میں چاہتا ہوں کہ نسیم صاحب اس پر کچھ روشنی ڈالیں - ڈاکٹر صاحب کو میں براہ راست مخاطب کرسکتا تھا - لیکن شاید وہ کھل کر دل کی بات میرے سامنے نہ رکھ سکتے -"

ضمیر صاحب کی اس مختصر تقریر سے سب نے سمجھ لیا کہ ضمیر صاحب کس فکر میں ہیں - اس وقت اسلام الدین صاحب کا عجیب حال تھا وہ امید و بیم کی حالت

میں تھے۔ سب سے زیادہ ہمہ تن گوش وہ نسیم صاحب کی طرف ہو گئے۔ نسیم صاحب نے جواب دیا۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے اس مسئلے پر گفتگو کی۔ ہم دونوں اس پر متفق ہیں کہ آپ صاحبان اللہ سے ڈرنے والے اور انسانیت کے بہی خواہ ہیں آپ جو کچھ ہمارے متعلق سوچیں گے اس میں ہمارے لیے بھلائی ہی ہوگی۔"

نسیم صاحب یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ اسلام الدین صاحب دم بخود سن رہے تھے۔ نسیم صاحب کے خاموش ہونے پر انہوں نے ایک لمبی سانس لی۔ ضمیر صاحب نے ان سے کہا۔

اسلام الدین صاحب! آپ ایک ذی عزت خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا رشتہ سارے رشتوں سے زیادہ مضبوط رشتہ ہے کیا میں آپ سے گذارش کر سکتا ہوں کہ آپ عائشہ کا رشتہ ڈاکٹر صاحب سے منظور فرمالیں گے۔"

میں تو اپنے کو اب اسی خاندان سے متعلق سمجھتا ہوں۔ جس میں رہ رہا ہوں میری لڑکی اس لائق تو نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی ——— شریک حیات بنے لیکن ڈاکٹر صاحب کے اخلاق و عادات سے امید ضرور ہے کہ اپنے طور پر اس کی تربیت کر لے جائیں گے۔"

تو پھر اس نیک کام میں دیر کاہے کی ہے؟" نسیم صاحب نے کہا اور پھر ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے جولدار صاحب سے کہنے لگے۔

میں احمد کا ولی ہونے کی حیثیت سے بطور منگنی یہ انگوٹھی پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ والدہ رشاد میری طرف سے عائشہ کو پہنا دیں۔ ساتھ ہی میں چاہتا ہوں کہ اسی وقت اس کار خیر سے فراغت کر لی جائے۔ میرا ارادہ ہے کہ کل میں احمد کو اپنے ساتھ شاہجہاں پور لے جاؤں۔"

دراصل واقعہ یہ ہے کہ بات یارانِ طریقت میں سے ہر ایک کے دل کی بات تھی۔ اسی وقت ایجاب و قبول کے مرحلے طے ہوئے۔ نسیم صاحب اور حولدار راشد علی صاحب گواہ بنے اور ضمیر صاحب نے ڈاکٹر احمد صاحب اور عائشہ کا نکاح کر دیا۔ اسلام الدین صاحب نے ایک سال پہلے جو دعا مانگی تھی وہ آج درجہ قبولیت کو پہنچی۔ اس سادہ تقریب کی خبر لوگوں کو اس وقت ہوئی جب نسیم صاحب کی طرف سے ضمیر صاحب اور راشد صاحب وغیرہ کے دوستوں کو شام کے وقت دعوتِ ولیمہ پر بلایا گیا جس نے سُنا وہ خوش ہوا۔ دوسرے دن نسیم صاحب جب ڈاکٹر صاحب اور عائشہ کو شاہجہاں پور لے جانے کیلئے تیار ہوئے تو رشاد اور لعل بضد ہوئے کہ ہم بھی باجی کے ساتھ چلیں گے۔ ان کو شاہجہاں پور جاتے دیکھا تو رضیہ نے بھی درخواست کی اور اسکی درخواست بھی منظور کرلی گئی اور پھر یہ مختصر قافلہ شاہجہاں پور روانہ ہوگیا۔

حادثہ

دیرہ ایکسپریس شاہجہاں پور سے کوئی ایک میل ہی آگے بڑھی ہوگی کہ ایک جھٹکے کے ساتھ یک دم رک گئی۔ مسافر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر بولے "کسی نے زنجیر کھینچ لی" اور پھر کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ اندھیری رات میں کسی کو کچھ دکھائی نہ دیا۔ اچانک عورتوں کے ڈبے سے چیخ و پکار کی آوازیں بلند ہوئیں۔ وہ مرد مسافر جنہوں نے اپنی عورتوں کو زنانے ڈبے میں بٹھا دیا تھا۔ گھبرا گھبرا کر اپنی اپنی نشستوں سے کودنے لگے۔ سب عورتوں کے ڈبے کی طرف دوڑ رہے تھے۔

ڈاکٹر احمد صاحب بھی اسی ٹرین سے بریلی واپس جا رہے تھے انہوں نے عائشہ کو رشاد، رضیہ اور لعل کے ساتھ زنانے ڈبے میں بٹھا دیا تھا اور خود پاس والے ڈبے میں نسیم صاحب کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے نسیم صاحب اپنے دوست کو

بریلی اسٹیشن تک بھیجے جارہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بریلی میں انہیں بواپسی ٹرین مل جائے گی۔ اُسی سے رات میں واپس ہو جائیں گے۔ یہ سب بھی اس حادثے سے چونکے۔ زنانہ ڈبہ ان کے ڈبے کے پاس تھا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب یسیم صاحب کے ساتھ پہنچے۔ وہاں ساری عورتیں بدحواسی کے ساتھ "دوڑیو پکڑیو" کی آوازیں بلند کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے عائشہ، رضیہ، رشاد اور لعل کو ان کی نشستوں پر نہ دیکھا تو ان کی پریشانی بڑھی۔ ڈبے کے اندر ہنگامۂ دار و گیر برپا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دیکھا، کچھ عورتیں بے تحاشہ کسی پر جوتیاں برسا رہی تھیں۔ عائشہ آنکھوں میں آنسو بھرے اور ہونٹ بھینچے ہوئے مضبوطی کے ساتھ کھڑکی بند کئے کھڑی تھی۔ اس نے پورا زور کھڑکی بند کرنے میں لگا رکھا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر ڈاکٹر "خبردار" کہہ کر اندر گھس گئے۔ ایک شریف اور تنومند شخص کو اندر آتے دیکھ کر عورتوں نے ہٹ کر راستہ دیدیا۔ لیکن وہ عائشہ سے اب بھی کہہ رہی تھیں کہ کھڑکی مضبوطی سے بند کئے رہنا ورنہ یہ بدمعاش نکل جائے گا۔

بدحواسی میں کسی کو یہ بھی ہوش نہ تھا کہ کون عورت پردہ کر چکی تھی اور کون نہیں۔ بہت سی عورتوں کے برقعے الگ رکھے تھے۔ عائشہ بھی اسی حالت میں تھی۔ عورتیں ہٹیں تو ڈاکٹر صاحب عائشہ کے پاس پہنچ گئے۔ "کیا ہے؟" ان کی زبان سے نکلا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک تگڑا سا آدمی اوندھا نیچے پڑا ہے اس کے پیروں میں رشاد اور لعل چمٹے ہوئے ہیں۔ ان دونوں نے اس کے پاؤں بازوؤں سے بھر رکھے تھے رشاد کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اوندھے پڑے ہوئے آدمی کی کمر کھڑکی میں پھنسی تھی اور وہ قریب قریب بے بس ہو چکا تھا۔ یہ دیکھ کر ڈاکٹر صاحب نے عائشہ سے کہا کہ اپنی جگہ جا کر بیٹھے۔ عائشہ سنبھلی۔ اس کی زبان سے نکلا۔ "ہائے اس بدمعاش نے رضیہ کو ڈبے سے باہر پھینک دیا۔ اور رشاد کو بے

پٹکا۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ اور یہ کہہ کر عائشہ رونے لگی۔ لعل اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی رضیہ کے لیے رو رہا تھا۔ رشاد اٹھ کر بیٹھ تو گیا مگر وہ خون میں نہایا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ ڈبّے کے اندر اور باہر آ کھڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کھڑکی کھولی بدمعاش آزاد ہوا۔ اس نے اس طرح آہ کی جیسے بڑی دیر کے بعد سانس اس کے سینے میں سمائی ہو۔ اس نے کروٹ بدلی لیکن اُٹھ نہ سکا۔ اندر راستہ ہوا تو نسیم صاحب کھڑکی میں ہوتے ہوئے دوسری طرف کود گئے۔ اور اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ ان کے پیچھے اور کئی نوجوان کودے۔ ڈائرکٹر صاحب، بدمعاش کو دیکھ رہے تھے کہ اب کیا کرنے والا ہے۔ لیکن وہ بے حس و حرکت چت پڑا رہا۔ "ہائے رام میری کمر!" وہ چلّایا اور اس نے اپنا سر ایک طرف ایک بکس سے ٹیک دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی کھڑکی بند کر دی۔

اتنی دیر میں ٹرین گارڈ اور اس کے اسٹاف کے لوگ آ گئے۔ انہوں نے لوگوں سے استدعا کی کہ اپنے اپنے ڈبّے میں جا کر بیٹھیں۔ اس کے بعد حال پوچھنے پر معلوم ہوا کہ گاڑی رُکتے ہی یہ بدمعاش ڈبّے میں آ گیا۔ رضیہ کو اُٹھا کر اس کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ باہر کچھ لوگ کھڑے تھے۔ انہوں نے رضیہ کو ہاتھوں پر روکا اور لے بھاگے۔ بے چاری نے صرف ایک آواز نکالی پھر شاید اس کا منہ بند کر دیا گیا۔ یہ بدمعاش بھی کودنے والا تھا کہ رشاد اس کی کمر سے لپٹ گیا۔ رشاد کو اس نے پٹک دیا۔ اتنی دیر میں لعل اس کی ٹانگوں میں چمٹ گیا۔ اس نے مضبوطی سے بازو بھر لیے تو بدمعاش اوندھا گرا۔ چاہتا تھا کہ گھسٹ کر لعل کو لیے ہوئے باہر جا گرے کہ عائشہ نے کھڑکی بند کر لی۔ بدمعاش کی کمر کھڑکی میں آ گئی اور اس طرح یہ پھنس کر رہ گیا۔

یہ واردات سُن کر ڈاکٹر صاحب نے انگریزی میں گارڈ سے کچھ کہا۔ جس

کے جواب میں اس نے کہا "یس" اور ڈبے سے اتر گیا۔ اس نے دو آدمیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے بدمعاش کو ڈبے سے گھسیٹا اور لاد کر گارڈ کے ڈبے کی طرف لے چلے۔ ڈاکٹر صاحب بھی ساتھ گئے۔ عورتیں کانپ رہی تھیں۔ ان کے مرد ان کو ڈھارس بندھا رہے تھے۔ عائشہ اور لعل سب سے زیادہ بے چین تھے۔ ٹرین سیٹی پر سیٹی دے رہی تھی۔ گویا وہ ان لوگوں کو بلا رہی تھی۔ جو رضیہ کو ڈھونڈنے گئے تھے۔ ٹرین کو رکے ہوئے آدھ گھنٹہ ہو گیا۔ ڈھونڈنے والے واپس آ گئے تھے نسیم صاحب نے آکر ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ رضیہ کا کچھ پتہ نہ چلا۔

"اناللہ وانا الیہ راجعون"۔ ڈاکٹر صاحب کی زبان سے نکلا۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ دعا کے لیے انہوں نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ نسیم صاحب بھی گارڈ کے ڈبے میں بیٹھ گئے۔ گاڑی شاہجہاں پور کی طرف واپس ہوئی تو نسیم صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔ "رشاد کا کیا حال ہے؟"

"اس کے سر میں بری طرح چوٹ آئی ہے۔ خون زیادہ نکل گیا ہے"۔

ٹرین شاہجہاں پور کے اسٹیشن پر رکی اسٹیشن ماسٹر دوڑا ہوا آیا۔ ریلوے پولیس آ گئی۔ بدمعاش ان کے حوالے کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب رشاد عائشہ اور لعل کو لے کر اتر پڑے۔ نسیم صاحب کے کان میں کچھ کہا۔ انہوں نے کہا "ابھی فوراً" اس کے بعد جب ٹرین پھر بریلی روانہ ہوئی تو نسیم صاحب اس پر بیٹھے ہوئے جا رہے تھے۔

بدمعاش اپنی کمر کے درد اور عورتوں کی جوتیوں کی مار سے کراہ رہا تھا اسے سپاہی پکڑ کر لے چلے۔ اس نے رشاد کی طرف اشارہ کر کے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔

"سرکار! اس لڑکے کا کیا نام لیا تھا آپ نے؟"

"کیوں؟"

سرکار! کیا آپ نے کہا تھا۔ "رشاد"۔

"ہاں، میں نے یہی نام لیا تھا لیکن تجھ سے کیا؟"

"کیا یہ رشاد وہی تو نہیں جو حولدار راشد علی خاں کے سپتر ہیں۔"

"ہاں یہ وہی رشاد ہے۔"

سرکار! یہ اور بتا دیجئے، رشاد اس لڑکی کا کیا لگتا ہے جسے میں نے ٹرین سے پھینکا تھا۔"

"بدمعاش کی اس پوچھ گچھ نے ڈاکٹر صاحب کو حیرت میں ڈال دیا انہوں نے پوچھا۔ تو کچھ اپنے بارے میں بتا۔ رضیہ رشاد کے اُستاد کی لڑکی ہے۔"

ہائے رام! میں نے یہ کیا کیا۔ ہائے بھگوان، یہ کرنے سے پہلے مجھ کو موت آجاتی۔" ہائے منّے کی ماں اسے ننھا دیوتا کہتی تھی۔ اب میں اسے کیا جواب دوں گا۔ ہائے دو سو کے لالچ میں میں نے یہ کیا کیا۔" بدمعاش پر دیوانگی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اب تو ڈاکٹر صاحب کو اور زیادہ کھوج پیدا ہو گئی۔ انہوں نے سپاہیوں کو روکا اور بدمعاش سے کہا۔

"اپنا پورا حال بتاؤ۔ بات کیا ہے؟"

سرکار، میرے منّے کو رشاد نے ٹرین میں دب جانے سے بچایا تھا۔ یہ سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت وہ ننھا دیوتا بارہ کے لگ بھگ تھا۔" اور یہ کہہ کر بدمعاش نے پھر اپنا سر پیٹ لیا۔ عائشہ نے ڈاکٹر صاحب کو اپنی طرف متوجہ کر کے بتایا کہ یہ واقعہ ملانی بی نے ہمیں سنایا تھا۔ اس سے پوچھئے، کیا اس کا نام گنگو ہے۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" ڈاکٹر صاحب نے اس سے پوچھا۔

"سرکار! میرا نام گنگو ہے۔"

ڈاکٹر صاحب عائشہ کی طرف دیکھنے لگے۔ عائشہ نے کچھ اور چپکے

چپکے بتایا تو ڈاکٹر صاحب نے سپاہیوں کو روک لیا۔ ان سے کہا کہ بریلی کی طرف سے
ٹرین آجائے تب وہ جائیں۔"

"سرکار! کچھ آپ سے کہوں گا۔"

"کہو" ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اسٹیشن ماسٹر اور سپاہی وغیرہ گنگو کی
طرف دیکھنے لگے۔ سب کو یہ انوکھا حادثہ معلوم ہو رہا تھا۔ گنگو نے کہا۔

پوری واردات تو میں حولدار صاحب کے آنے پر انہیں بتاؤں گا۔
ہاں آپ کے اطمینان کیلیے یہ بتادوں کہ رشاد بھیّا کی وہ جو ہے کیا نام لیا تھا آپ نے
"رضیہ" اس کا پتہ میں بتادوں گا۔ اور یہ کہہ کر وہ رشاد کی طرف بڑھا اور اس سے
لپٹ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ عائشہ رضیہ کے لیے رو رہی تھی۔ لعل اور رشاد گم
صُم تھے۔

"ہاں تو گنگو! تم بتاؤ رضیہ کہاں ہے؟"

"سرکار کتنی دیر ہوئی اُس واردات کو؟"

"ڈیڑھ گھنٹہ!" ڈاکٹر صاحب نے گھڑی دیکھی۔

اوہ میرے بھگوان۔ ڈیڑھ گھنٹہ۔ اب تو وہ نکل گئے۔"

"کون نکل گیا۔"

مگر کہاں جائیں گے سرکار۔ کچا چبا ڈالوں گا سب کو۔" گنگو دانت
پیسنے لگا۔

"گنگو! ان کا نام بتاؤ۔"

سرکار! نام تو حولدار صاحب کو بتاؤں گا۔ اور یہ کہہ کر اس نے پھر رشاد
کو بھینچ لیا۔

"خیر نہ بتاؤ۔" ڈاکٹر صاحب نے اُس کی طرف سے رُخ پھیر لیا۔ اسٹیشن ماسٹر صاحب سے

پوچھا۔ ٹرین آنے میں کتنی دیر ہے؟ اس نے بتایا اب دیرہ ایکسپریس بریلی پہنچا ہوگا۔ ادھر سے ڈیڑھ گھنٹے میں ٹرین آجائے گی۔"

"تو کیا نسیم صاحب حولدار صاحب کو اس سے نہ لاسکیں گے؟"

"میرا خیال ہے اب حولدار صاحب کو کوئی ٹیکسی پکڑنا ہوگی۔"

"اُف یہ انتظار کی گھڑیاں۔ ماسٹر صاحب کیا آپ کوئی ڈاکٹر بلا سکتے ہیں رشاد اور گنگو کو دکھانا ہے۔"

"گنگو کے لیے۔"

"جی ہاں۔ ڈاکٹر جو فیس لے گا میں دوں گا۔"

"بہتر ہے۔" کہہ کر اسٹیشن ماسٹر نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا۔ وہ دوڑتا ہوا گیا اور ڈاکٹر عباد صاحب کو انہی کی کار پر لے آیا۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ایک کمپاؤنڈر تھا۔ اسٹیشن ماسٹر صاحب نے ڈاکٹر احمد صاحب کا تعارف کرایا اور بتایا کہ آپ شانتی نکیتن میں عربی کے شعبے کے انچارج ہیں۔"

جی ہاں جی ہاں۔ میں نے نام تو سنا ہے۔" ڈاکٹر عباد صاحب نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ڈاکٹر احمد صاحب نے ہاتھ ملایا پھر رشاد اور گنگو کی طرف اشارہ کر کے سارا حال بتایا۔

ڈاکٹر صاحب نے رشاد کو دیکھ کر بتایا۔ "ٹھیک ہے اور اُسے اپنے کمپاؤنڈر کے حوالے کردیا۔ گنگو درد کے مارے بیقرار تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی چیخیں نکل جاتی تھیں۔ ڈاکٹر عباد صاحب نے کمپاؤنڈر سے ایک انجکشن لگوایا۔ اس انجکشن سے گنگو کو درد کم ہوتا محسوس ہوا۔ اب ڈاکٹر عباد نے تین گولیاں یکے بعد دیگرے گنگو کو کھلائیں۔ اس کے بعد تیل کی قسم کی رقیق دوا اس کی کمر میں ملوائی

ڈاکٹر عباد نے بتایا کہ سخت ضرب کے باوجود گنگو کی کمر سالم ہے۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اسٹیشن کے باہر ایک ٹیکسی فراٹے بھرتی ہوئی آکر رُکی۔ اس میں سے نسیم صاحب، حولدار لال شدعلی خاں اور اسلام الدین صاحب اترے۔ تینوں کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی ڈاکٹر احمد صاحب لپکے۔ عائشہ اسلام الدین صاحب سے لپٹ کر ہچکیاں لینے لگی۔ ان دونوں بزرگوں نے بڑے ضبط کا ثبوت دیا۔ لعل اور عائشہ کو تسکین دی۔ دعاء کی تلقین کی۔ رشاد کو دیکھ کر ذرا اطمینان ہوا تو گنگو کو دیکھ کر حولدار صاحب کی زبان سے نکلا۔"

"ارے تم؟"

ہاں سرکار! میں ہوں گنگو نمک حرام آپ کا۔" اس نے رشاد کو الگ کیا۔ چاہتا تھا کہ اپنا سر زمین پر دے مارے کہ حولدار صاحب نے بڑھ کر روکا۔

نہیں بھائی! کیا کرتے ہو۔ تمہارا درد کیسا ہے؟ نسیم صاحب سے تمہارا حال معلوم ہوا۔"

ڈاکٹر عباد صاحب نے فرمایا چند منٹ کی مہلت اور چاہتا ہوں۔ میرا کام مکمل ہوا چاہتا ہے۔" اب اسٹیشن ماسٹر نے اجازت دی اور بتایا کہ ٹرین آرہی ہے۔ ڈاکٹر احمد صاحب نے اسٹیشن ماسٹر سے ہاتھ ملایا۔ دس دس کے پانچ نوٹ نکال کر ڈاکٹر عباد کو دینے لگے۔ انہوں نے کہا:۔

"جناب میں معمولی ڈاکٹر نہیں ہوں۔"

"اور لیجیے!" ڈاکٹر احمد صاحب نے سو کا نوٹ نکالا۔

"جی نہیں!"

"پھر؟"

اگر آپ میری پوری فیس دینا چاہتے ہیں تو اس وقت سب صاحبان

کے ساتھ غریب خانہ پر تشریف لے چلیں۔ مریض کو بھی لے چلیں۔ یہ سپاہی بھی چلیں گے۔ صبح کو ملزم حوالات بھیجدیا جائے گا۔ مگر یہ خوب ہے کہ مدعی مدعا علیہ کے ساتھ یہ برتاؤ کر رہا ہے۔

ڈاکٹر احمد صاحب مسکرا دیئے۔ نوٹ انہوں نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد دو پھیروں میں سب ڈاکٹر صاحب کی کار سے ان کی کوٹھی پر گئے۔ جاتے وقت اسٹیشن ماسٹر سے کہا۔ ہم گنگو پر کیس چلانا نہیں چاہتے۔

ڈاکٹر عباد صاحب کی کوٹھی کے ایک کمرے میں حولدار صاحب نے گنگو کو بلایا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔ باہر کوئی سُن تو نہیں رہا ہے۔ حولدار صاحب نے اطمینان دلایا تو بولا "یہ سب آپ کے بھائی کے کرتوت ہیں۔ مجھے دو سو دیئے اور آپ کا واسطہ دیا۔ یہ نہیں بتایا کہ یہ لڑکی رشاد کے اُستاد کی ہے اور رشاد سے بہت ہلی ملی ہے۔ مجھے تو اب معلوم ہوا۔ رضیہ اور رشاد کا میل کیسا ہے۔ دیکھئے طے یہ ہوا تھا۔ آپ کے بھائی صاحب پکی سڑک پر کار تیار رہیں گے۔ انہوں نے کسی طرح معلوم کر لیا تھا کہ رضیہ اس ٹرین سے جا رہی ہے وہ تو مدت سے پیچھے پڑے ہیں ان کے لوگ مدتوں سے مخبری کر رہے ہیں۔ اب موقع ہاتھ آیا تو مجھ سے سانٹھ گانٹھ کی۔ آپ کا واسطہ دیا تو میں تیار ہو گیا۔ میں کیا جانوں کہ بڑا بھائی چھوٹے بھائی کی گھات میں ہے۔ انسپکٹر صاحب کے آدمی ٹرین پر موجود تھے انہی نے زنجیر کھینچ کر ٹرین رکوائی۔ میں تیار تھا ہی۔ ٹرین رُکتے ہی زنانہ ڈبے میں گھس گیا۔ اتنی دیر میں وہ آدمی بھی آ گئے۔ میں نے رضیہ کو اٹھا کر انہیں دے دیا۔ وہ اندھیری رات میں لے بھاگے پہلے رشاد نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی اُسے میں نے دھکیلا لیکن لعل ٹانگوں میں چمٹ گیا میں پھنس گیا۔ انسپکٹر صاحب کے آدمی رضیہ کو لے کر سڑک پر گئے ہوں گے۔ وہاں انسپکٹر صاحب نے ان دونوں کو ڈانٹا ہو گا۔ ڈانٹ سُن کر

وہ بھاگ گئے ہوں گے۔ رضیہ انسپکٹر صاحب کو تو پہچانتی ہی ہے اس نے سمجھا ہوگا کہ انہوں نے بدمعاشوں سے چھڑایا۔ پھر تو وہ ان کو اپنا ہمدرد سمجھ کر ان کے ساتھ خاموشی سے چلی گئی ہوگی۔ انہوں نے رضیہ کو بٹھایا ہوگا۔ اب تو وہ لکھنؤ پہنچ گئے ہوں گے۔

اچھا خیر اب تم یہ راز کی باتیں کسی سے مت کہنا۔ میں جیسا مناسب ہوگا کروں گا۔ کوشش کروں گا کہ صبح ہی تم کو لے کر لکھنؤ پہنچوں اور پھر وہاں خدا جو تدبیر بتلائے گا کروں گا۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں اتنے میں فجر کی اذان کی آواز آئی۔ حولدار صاحب اس کے پاس سے اُٹھ گئے

تلاش

نماز فجر کے بعد ڈاکٹر عباد صاحب نے بڑے تکلف سے سب کو ناشتہ کرایا۔ ناشتہ کراتے وقت انہوں نے ایک کوشش یہ بھی کی کہ ان سب کا غم غلط ہو۔ انہوں نے بڑی دلچسپ باتیں کیں۔ ناشتہ کے بعد حولدار راشد علی خاں، اسلام الدین صاحب، گنگو ڈاکٹر احمد صاحب اور نسیم صاحب سر جوڑ کر بیٹھے۔ رضیہ کے لیے مشورہ کیا۔ طے یہ ہوا کہ ڈاکٹر احمد صاحب، رشاد، عائشہ اور لعل کو لے کر بریلی جائیں۔ وہاں صرف ضمیر صاحب کو حالات کا علم ہے۔ عورتوں کو ابھی کچھ نہیں بتایا گیا ہے۔ ڈاکٹر احمد صاحب، ضمیر صاحب کی رائے سے چاہیں تو عورتوں کو حادثے سے باخبر کر دیں ان کی رائے نہ ہو تو ہمارے آنے تک ٹالیں۔ یہاں حولدار راشد علی خاں صاحب گنگو کو لے کر لکھنؤ جائیں۔

یہی فیصلہ کر کے سب اٹھے۔ ڈاکٹر عباد صاحب سے ملے۔ ان کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر عباد صاحب نے کچھ گولیاں اور ایک تیل گنگو کو دیا۔ اور جب انہیں

یہ معلوم ہوا کہ گنگو راشد صاحب کے ساتھ لکھنؤ جا رہا ہے تو اس کے ایک انجکشن اور لگوایا۔

یہ سب ہونے کے بعد ڈاکٹر احمد صاحب رشاد، عائشہ اور لعل کو لے کر بریلی واپس ہوئے۔ نسیم صاحب سب سے مل کر اپنے گھر گئے۔ اور حولدار راشد علی خاں گنگو کو لے کر لکھنؤ روانہ ہو گئے۔

لکھنؤ پہنچ کر سیدھے کوتوالی پہنچے۔ کوتوال سے ملے۔ حال بتایا اور کہا میں چاہتا ہوں "لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اور سانپ بھی مر جائے"۔ بھائی کا معاملہ ہے۔ ان کی بدنامی بھی میں نہیں چاہتا اگر بھائی صاحب سیدھے سادھے رضیہ کو واپس کر دیں تو ٹھیک ہے نہیں تو آپ چاہیں رپٹ درج فرمالیں۔

کوتوال دیال شرما پرانے اور جہاں دیدہ کوتوالوں میں سے تھے۔ وہ حولدار راشد علی خاں اور انسپکٹر مرشد علی خاں دونوں سے واقف تھے۔ دونوں سے تعلقات بھی تھے۔ حالات سن کر دیر تک سوچتے رہے۔ اس کے بعد کہا۔

مرشد علی خاں صاحب کو نامزد کیے بغیر رپٹ تو لکھا ہی دو۔ اس کے بعد ہم تم چلیں۔ اُن سے بات کریں۔ دیکھیں ان کا رویّہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پہلے وہ انکار کریں گے لیکن جب انہیں معلوم ہوگا کہ گنگو آیا ہوا ہے تو ڈھیلے پڑ جائیں گے۔ اور اگر پھر بھی نہ مانیں گے تو خانہ تلاشی لے کر رضیہ کو برآمد کرلیا جائے گا۔ وہ جس حسنِ تدبیر سے لڑکی کو لائے ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ لڑکی ان کے گھر میں ہی ہے۔ اس پر زیادہ بندش بھی نہیں ہے کیونکہ لڑکی کو ان پر دہرا اعتماد ہو چکا تھا جبکہ اس نے شاہجہاں پور میں انہیں اپنا ہمدرد اور مددگار سمجھ لیا تھا۔ اگر میرا قیاس صحیح ہے اور رضیہ پر زیادہ بندش نہیں ہے تو ہو سکتا ہے کہ جیسے ہی اس کے کان میں آپ کے کی بھنک پڑے وہ دوڑ کر آپ کے پاس آجائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو قانونی کارروائی کی

جلئے گی۔ اس وقت یہ رپٹ کام دے گی۔

اگر آپ فرمائیں تو گنگو کو شریف ہوٹل میں ٹھہرادوں۔ ضرورت ہوگی تو وہاں سے بلالیا جائے گا۔ ہوٹل میں اُسے آرام ملے گا اور اُسے آرام کی ضرورت ہے۔

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر کوتوال نے منشی کو بُلایا۔ کچھ سمجھایا اور کہا کہ اس طرح رپٹ درج کرلو۔ ادھر راشد علی خاں گنگو کو لے کر شریف ہوٹل پہنچے۔ وہاں اس کے آرام کا انتظام کردیا۔ خود بھی غسل کیا اور کچھ کھایا پیا۔ اس کے بعد پھر کوتوالی آئے یہاں کوتوال صاحب چلنے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ حولدار صاحب کو دیکھا تو سب انسپکٹر چوہان سنگھ کو کچھ ہدایات دیں اور پھر حولدار صاحب کے ساتھ مرشد علی خاں صاحب سے ملنے چل دیے۔

جس وقت یہ دونوں پہنچے۔ مرشد علی خاں صاحب گھر کے اندر کھانا کھا رہے تھے ان کے ساتھ بال بچے بھی دسترخوان پر بیٹھے تھے۔ رضیہ ارشد اور رئیسہ سلطانہ کے درمیان بیٹھی کھا رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ "بڑے ابّا! تو آج آپ مجھے چڑیا گھر دکھائیں گے نا! آج مجھے چڑیا گھر دکھا دیجئے اور کل بریلی لے چلئے گا۔ اچھا بڑے ابّا صاحب!"

گھر والے سب اُسے تسلی اور دلاسا دے رہے تھے۔ اتنے میں گھنٹی بجی۔ مرشد علی خاں صاحب نے بُوا کی طرف دیکھا۔ بُوا صدر دروازے کی طرف چلیں۔ کوتوال کو دیکھ کر اُلٹے پاؤں واپس آئیں اور مرشد علی خاں صاحب کے کان میں کہا "کوتوال صاحب ہیں اور ایک آدمی بھی ساتھ ہے۔"

"اور کوئی بھی ہے؟" مرشد علی خاں کھٹکے۔

"اور تو کوئی سپاہی پیادہ ساتھ نہیں ہے۔" بوا نے بتایا۔

"اچھا تو کمرے میں بٹھادو اور چاء کا پانی چڑھادو۔"

اس کے بعد جلد جلد دو چار نوالے اور کھائے۔ ہاتھ دھوئے۔ بیوی کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر نالے کے پاس اُن کے پاس گئی۔ بولے "مجھے اندیشہ ہے۔ تم رضیہ کو

چڑیا گھر دکھانے کے بہانے ارشی کے ساتھ ہمسائی کے گھر کی طرف سے شریف ہوٹل پہنچا دو اور کہہ دو کہ وہاں ایک کمرے میں بڑی احتیاط سے ٹھہرے۔ بچوں کو بھی ساتھ کر دو تاکہ راستے اور ہوٹل میں کسی کو شبہ نہ ہو۔ میں کوتوال کو چلّ دے کر کے آتا ہوں اور رضیہ کو رائے بریلی بھجواتا ہوں۔"

پھر مرشد علی خاں صاحب نے پان منہ میں رکھا اور خاصدان لیے ہوئے مردانہ کمرے کی طرف چل دیئے۔ بیوی نے ارشد کو ساری اسکیم سے آگاہ کر دیا اور رضیہ سے کہا "بیٹی جاؤ چڑیا گھر دیکھ آؤ۔"

مرشد علی خاں صاحب نے کمرے میں قدم رکھا۔ سامنے چھوٹے بھائی راشد کو کوتوال کے برابر بیٹھے دیکھا تو صورتِ حال سامنے آگئی تھی۔ گھاگ آدمی تھے ذرا جھجکے لیکن انہوں نے چہرے مہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ بھائی کو دیکھتے ہی بولے۔

"ارے بھئی! تم کس وقت آئے؟ اور گھر میں کیوں نہیں آ گئے۔ وہاں کوئی تمہارے پردے کا تو ہے نہیں؟"

"کوتوال صاحب سے ملنا ضروری تھا۔"

"اچھا خیر۔ تم بھوکے ہو گے۔ اندر جاؤ کھانا کھا لو جا کر۔"

اطمینان کے یہ کلمات سن کر حولدار راشد علی خاں اور کوتوال صاحب نے سمجھ لیا کہ رضیہ گھر پر نہیں ہے۔ کوتوال صاحب نے بے تکلف ہو کر کہا۔

"بھئی خوب! اپنے بھائی کو تو پوچھا اور مجھے؟"

"نہیں نہیں، یہیں منگاتا ہوں۔ معاف فرمایئے گا اور یہ کہہ کر انہوں نے کمرے کے دروازے سے اندر دیکھا اور پکار کر کہا۔

"بُوا! کھانا یہیں دے جاؤ۔"

ٹھیک اسی وقت کوتوال نے حولدار راشد علی خاں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے

دروازے پر پہنچ کر مرشد علی خاں سے کہا۔

"بھائی صاحب! کھانا میں کھا کر آیا ہوں۔" اور یہ کہتے کہتے صحن میں دیکھا میدان صاف نظر آیا۔ انہوں نے بُرا سا منہ بنایا۔ مطلب یہ تھا کہ کوتوال صاحب سمجھ ہیں۔

لاحول ولا قوۃ، گھر موجود ہوتے ہوئے باہر کیوں کھایا؟ اور بولے کہا کہ چا لے آئے۔

"معاف کیجئے۔ بڑی بھوک لگی تھی۔"

"اچھا تو بلا اطلاع کیسے آ گئے۔"

"ایک مشورہ کرنا تھا۔"

"کیا؟"

"رضیہ اغوا کر کے یہاں لائی گئی ہے۔"

"رپٹ لکھا دی؟"

"جی ہاں! کوتوال صاحب نے فرمایا کہ آپ سے بھی مشورہ کر لیا جائے۔"

میں تو وہ میدان چھوڑ چکا۔ اب گھر میں بیٹھا اللہ اللہ کرتا ہوں میرے علم میں کچھ نہیں ہے۔"

بھائی صاحب آپ کے علم میں ہوتا تو آپ کی عنایات سے یہی توقع تھی کہ آپ فوراً فون کرتے۔ میں تو مشورہ کرنے آیا ہوں کہ کس طرح رضیہ کو اتنے بڑے شہر میں تلاش کیا جائے۔"

"کوتوال [illegible] اس کے لیے کافی ہیں۔"

اس بے اعتنائی سے کوتوال صاحب سمجھ گئے کہ [illegible] کے معاملے میں بھائی کا پریشان نہ ہونا کچھ معنی رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں آپ کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ویسے ہمیں کچھ پتہ تو لگا ہے۔"

کیا؟ کیا پتہ لگا ہے؟" اور یہ کہتے کہتے خواہ مخواہ مرشد علی خاں صاحب نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے کے پسِ پردہ شاید بیوی رئیسہ سلطانہ کھڑی تھیں۔ راشد علی خاں نے بھی اُدھر دیکھا اور کمرے ہی سے پکارے

"بھابی سلام!"

"اچھا۔ آپ بھی ہماری گفتگو سن رہی ہیں۔" کوتوال نے طنزاً کہا۔ مرشد علی خاں نے اس کا جواب کچھ نہیں دیا۔

تعجب ہے۔ بھائی بھائی کی مدد کو تیار نہیں۔" کوتوال نے کہا۔

جی ہاں! عجیب زمانہ لگا ہے۔ غور فرمائیے۔ میں نے راشد کو اس کے بچپن سے پالا۔ بڑا ہوا تو کام سے لگایا۔ پھر ابھی سال بھر گذرا میں نے ایک کام ان حضرت کے سپرد کیا۔ ٹکا سا جواب دے دیا۔

"حولدار صاحب بڑے افسوس کی بات ہے آپ نے اپنے محسن بھائی کی بات ٹال دی۔" کوتوال صاحب نے راشد علی خاں سے کہا۔

کیا عرض کروں صاحب وہ کام میرے بس کا نہ تھا۔" یہ حولدار صاحب کا جواب تھا۔

"تو جناب یہ کام میرے بس کا نہیں۔" یہ مرشد علی خاں صاحب کا جواب تھا۔

اچھا تو میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ گنگو میرے ساتھ آیا ہوا ہے۔" حولدار صاحب بولے اور مرشد علی خاں صاحب کے چہرے کا رنگ فق ہوا ہی چاہتا تھا کہ انہوں نے اپنے کو سنبھال لیا۔

"گنگو کون؟ میں اُس سے واقف نہیں۔"

وہ آپ سے واقف ہے اور آپ کا بہت ممنون ہے۔ آپ نے کسی کام کے عوض دو سو روپیہ اُسے عنایت کئے۔" اب مرشد علی خاں کو پاؤں تلے کی زمین کھسکتی نظر آئی۔ مگر پھر انہوں نے قابو حاصل کر لیا۔ بولے۔"

میں نے کسی گنگو کو دو سو روپیہ کبھی نہیں دیئے۔" مرشد صاحب نے تیور بدل کر کہا۔

بھائی صاحب! رضیہ کو آپ لائے ہیں۔ براہ کرم ....."

حولدار کو اس انداز سے بات کرتے دیکھا تو کوتوال نے روک دیا اور مرشد علی خاں سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اپنے گھر کی تلاشی دیں۔ اتنی دیر میں ہم گنگو کو بلائے لیتے ہیں۔ ذرا ٹیلی فون ادھر بڑھایئے

یہ لیجئے ٹیلی فون! اور خانہ تلاشی لے لیجئے لیکن میں کہتا ہوں کہ راشد میاں میری بے عزتی تمہارے حق میں اچھی نہ ہوگی۔"

راشد علی خاں نے کچھ جواب نہ دیا۔ کوتوال صاحب نے شریف ہوٹل کا نمبر ملایا۔ ہوٹل کے مالک سے کہا کمرہ ۲ میں گن گو نامی ایک شخص ہے اسے ریٹائرڈ انسپکٹر مرشد علی خاں کے مکان پر فوراً بھیج دیجئے۔

کیا؟ کیا کہا آپ نے؟ .... گن گو..... اور یہ سب کس وقت پہنچے....

ابھی ابھی! .... تو ہاں ہاں.... خوب.... پہچان لیا... اچھا.... میں آیا....

خبردار ہوٹل سے کوئی شخص باہر نہ جانے پائے۔ ٹیلی فون پر کوتوال صاحب یہ گفتگو کر رہے تھے اور مرشد علی خاں صاحب کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ بے ربط جملے اور ان کا مطلب سمجھ رہے تھے۔ اس کے بعد کوتوال صاحب نے کوتوالی کا نمبر ملایا اور حکم دیا کہ ایک درجن سپاہی فوراً شریف ہوٹل کو گھیر لیں میں وہیں آتا ہوں۔

یہ سن کر مرشد علی خاں کا خون خشک ہو گیا حولدار راشد علی خاں نے پوچھا

"کوتوال صاحب خیریت ہے۔ شریف ہوٹل میں؟"

"جی ہاں! اب ہم آپ اور آپ کے بھائی صاحب وہیں چلتے ہیں"

"میرا وہاں کیا کام؟"

انسپکٹر صاحب! آپ مجھ سے صریحاً جھوٹ بولے۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ ہوٹل میں آپ کے فرزند ارجمند رضیہ کو لے کر پہنچے۔ حسنِ اتفاق یا آپ کے لیے سوئے اتفاق سے گنگو نے دیکھ لیا اور پہچان لیا۔ اب فرمائیے آپ کیا کہتے ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ چل رہے ہیں یا میں قانون کو حرکت میں لاؤں۔"

مرشد علی خاں کی زبان بند ہو گئی۔ کچھ کہہ نہ سکے۔ انہوں نے اپنے خیال میں میدان مار لیا تھا۔ لیکن وہی مثل ہوئی کہ خود اپنے آپ دام میں صیاد آگیا۔ انہوں نے حسنِ تدبیر سے رضیہ کو شریف ہوٹل پہنچا تو دیا تھا مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ وہاں گنگو موجود ہے۔ سر جھکا کر کوتوال کے ساتھ ہو لیے اور دل ہی دل میں کہنے لگے۔

"ہائے کیسی پڑی سر پر مرے اللہ نئی"